میرا کھویا ہوا ہاتھ

سلطان سبحانی

طبع اوّل

سرورق	سلطان سبحانی
کتابت	سراج احمد دلدار
ناشرین	صبا نگار۔ شگفتہ نسرین
ترتیب	اسماعیل راز
طباعت	نورانی پریس، مالیگاؤں
سرورق طباعت	طاہر اسکرین آرٹس، مالیگاؤں
سالِ اشاعت	۱۹۸۶ء
تعداد اشاعت	پانچ سو
قیمت	تیس روپے

ہم زباں پبلیکیشنز

۱۹۳ - ایم - آئی - بی کالونی، مالیگاؤں، ناسک۔

نئے افسانہ کے نقّادوں کے نام

راس آئے تو ہر سر پہ بہت چھاؤں گھنی ہے
ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر ریز بہت ہے

(مجروح)

یہ ایک مجلسِ تقسیمِ جبّہ و دستار
ہر ایک چہرے پہ
حرکت میں گل گردشِ نظر
تعلقات کی میزانوں میں وفاداری
یہاں ہر ایک اشارہ ہے شہسوارِ سند
کسی بھی سمت چلے
یا کہیں بھی جاکے گرے
بہت طلسمِ فضیلت، بہت ہراسِ نظر
کہ ایک حرفِ دیانت
مرے لبوں سے اٹھا
ہوا چلی بھی نہیں اور شامیانہ گرا
کہیں عصا، کہیں مسند
کہیں عمامہ گرا

ترتیب

پیش لفظ

پروفیسر قمر رئیس

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانہ پر اپنے ایک مضمون میں بعض باریک دلیلوں اور کئی مغربی نقادوں کے حوالوں کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے۔

'اردو افسانہ میں دیہات کی پیش کش' اردو افسانہ میں عورت
کی پیش کش' اردو افسانہ میں فلسفہ' یہ سب تو ہو چکا اب
ذرا واقعہ بیان ہو جائے۔" (ایوانِ اردو۔ اگست ۸۶)

فاروقی صاحب کو خوشی ہے کہ نیا ہم عصر اردو افسانہ پریم چند کی روایت سے رشتہ منقطع کرنے کی کوشش میں خاصہ کامیاب ہے اور اب وہ قدیم بیانیہ کی روایت سے جڑ گیا ہے یا جڑ رہا ہے۔ قدیم بیانیہ سے ان کی مراد داستانوں کی روایت ہے جس میں بقول ان کے 'کردار نگاری کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس بیانیہ کا دوسرا وصف یہ ہے کہ مصنف یا کسی کردار کا نقطۂ نگاہ اس میں بروئے کار نہیں ہوتا' اور ان سب کے نتیجے میں اس کی تیسری خوبی یہ بنتی ہے کہ داستانوں کی طرح وہ کسی مرکزی خیال یا فکر سے عاری ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے۔ لکھتے ہیں۔

"قدیم روایت کی رو سے وہ شخص اہم نہیں جس پر واقعہ گذرا
بلکہ واقعہ خود اہم ہے۔ اس طرح اس چیز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے
جسے ہنری جیمز نقطۂ نظر کہتا ہے۔"

اس منطق کا اطلاق اگر تنقید پر کیا جائے تو وثوق سے کہا جائے گا کہ فاروقی صاحب الطاف حسین حالی کی روایت سے انحراف کر کے قدیم تذکروں کی روایت سے رجوع ہو گئے ہیں جس

میں سارا زور بیان اور بدیع کی باریکیوں پر ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ فنکار نے کیا کہا ہے، کن محرکات کے زیر اثر کہا ہے اور وہ قاری پر کس طرح کی کیفیت یا اثرات مرتب کرتا ہے؟

فاروقی صاحب کی تشویش کا باعث یہ ہے کہ نئے افسانے سے بیانیہ کو ان کے پے در پے حملوں کے باوجود، پریم چند کی روایت سے مکمل نجات نہیں مل سکی ہے۔ یعنی نئے افسانے میں آج بھی راوی سے زیادہ مصنف اور اس کا نقطۂ نظر حاوی نظر آتا ہے۔ مصنف آج بھی پریم چند کی طرح، افسانہ میں کچھ کہنے کے لئے بے چین دکھائی دیتا ہے۔ وہ حریف سماجی قوتوں اور اداروں کی بے رحمی اور استحصال کے خلاف اپنے جذبات کی تحریک پر ہی قلم اٹھاتا ہے۔ اور گرد و پیش کی المناک صورتحال کو بدلنے کی کوشش رکھتا ہے۔ یہ بات فاروقی صاحب کو گوارہ نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ داستانوں کے راوی کی طرح آج کا افسانہ نگار بھی صرف واقعہ بیان کر دے اور بس۔ جس سے قاری داستانوں کی طرح محظوظ ہوں۔ اور اگر اس میں کچھ اشکال یا علامتیں ہوں تو ان کی تشریح سے جی بہلائیں۔ اپنے موقف کی وکالت میں فاروقی صاحب یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ پریم چند کی جس روایت کا وہ مضحکہ اڑاتے ہیں وہ حقیقت پسندانہ فکشن کی دنیا کی عظیم ترین روایت کا ایک حصہ ہے جس کی تعمیر گوگول، ٹالسٹائی، چیخوف اور گورکی ہی نے نہیں، بلکہ چارلس ڈکنس، بالزاک اور وکٹر ہیوگو جیسے ادیبوں نے بھی کی ہے۔

اس روایت سے روگردانی کر کے آج کا افسانہ نگار کچھ عجوبہ تجربہ تو کر سکتا ہے اور اُن سے فاروقی جیسے ذہین قاری لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ ایسے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا جس میں زندگی کی آویزشوں کا ادراک آرٹ کا افسوں جگاتا ہے، جو قارئین کے وسیع تر حلقہ کو متاثر کرتا ہے اور جہاں روایت تازہ تر معنوی اور صوری لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ تخلیق زندگی کی پیچیدہ حقیقت کے صرف ایک رُخ کو نہیں بلکہ اس کے کئی رُخوں، کئی پہلوؤں کو بے روا کرتا ہے۔ اس لئے اس کی فنی شناخت اور تاثر میں ایک مرکزی نقطہ کے گرد کئی معنوی جہتیں ہالہ بناتی ہیں۔ احساس کی کئی لہریں جال بنتی ہیں اور رنگوں کے کئی متحرک پیکر ابھرتے ہیں لیکن ——— جیسا کہ کہا گیا اس رنگا رنگ فضا کے پیچھے ایک بھرپور تجربہ کا ارتکاز ضرور ہوتا ہے جو افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کا تابع اور ترجمان ہوتا ہے۔

نیا اردو افسانہ شاید نیا صرف اس لئے ہے کہ وہ فاروقی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے منکر ہے۔ وہ لایعنیت سے برگشتہ ہے اور انسان دوستی کی ایک توانا روایت کا آئینہ دار ہے۔ وہ عہدِ حاضر کے آشوب کے خلاف اپنی برہمی اور بیزاری ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے انسانی احساس و عمل کو پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے وہ افسانہ کے اسلوب اور آہنگ کو حسن آفریں میڈیم میں ڈھالنے کا ہنر جانتا ہے۔

اس کے ثبوت کے لئے سلطان سبحانی کے افسانوں کا حوالہ ہی کافی ہے۔

سلطان سبحانی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "اجنبی نگاہیں" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ "راستے بھی چلتے ہیں" ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا۔ اس کے بعد ایک وقفہ آیا جب وہ چپکے سے شاعری کی طرف مائل ہو گئے اور اب وہ اپنے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔

سلطان سبحانی کے پہلے دور کی کہانیوں میں سخت کھردری اور بے رحم حقیقتوں کے گرد رومانی احساس و فکر کا ایک شبنمیں ہالہ سا نظر آتا ہے وہ کرشن چندر کی طرح حسن و عشق کی سیمابی کیفیتوں اور فطرت کے جاں گداز نغموں کے سہارے اس طرح آگے بڑھتے ہیں کہ قاری پوری طرح ان کی گرفت میں آجاتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اسے زندگی کی سفاک حقیقتوں کے دہانے تک پہونچا دیتے ہیں۔ نیم کا درخت، بھنڈار دار سے گھوڑنی تک۔ زلیخا۔ اندر کا آدمی اور دوسری کئی کہانیوں میں یہ ڈرامائی تکنیک بڑی موثر ہے یہاں کرشن چندر جیسی شاعرانہ منظر آرائی اور پیکر تراشی تو نہیں ہے لیکن محنت کش انسانوں کی روزمرّہ زندگی کا مشاہدہ اور ان کے درد و کرب کا احساس کرشن چندر سے کم نہیں ہے اس لئے کہ مصنّف خود اسی طبقہ سے وابستہ رہا ہے اسی کے زاویۂ نظر سے اسنے زندگی کی تباہی کو دیکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہ افسانے اس ادیب کے ہیں جس کی زندگی شبستانوں اور لالہ رخوں کے کاشانوں میں نہیں بلکہ کارخانوں اور مشینوں کے شور میں گذری ہے۔" (اجنبی نگاہیں)

زیرِ نظر مجموعہ میں شامل کہانیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے فنی پیرایۂ اظہار اور فکری جولانیوں کے میدان میں خاصہ طویل سفر طے کیا ہے وہ کھری حقیقت نگاری

کے سادہ اسلوب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اپنے طبقاتی احساس و شعور کو بنیاد بنا کر اس نے ایک آفاقی وژن کی تربیت کی ہے۔ ترقی پسندی کی مروجہ اور مانوس روایتوں اور حدوں کو (جو اس کی پرواز میں حائل تھیں) اس نے ایک جرأت آزماجست میں پار کر لیا ہے۔ مثلاً رجائیت۔ خوش انجامی نیکی کی فتح وغیرہ۔ لیکن زیردستوں کی حمایت سے وہ دست بردار نہیں ہوا ہے۔ افکار اور نظریات کی جنگ جو زندگی کے ہر منطقہ میں جاری ہے اس میں وہ عقلی اور انقلابی قوتوں کا طرفدار ہے۔ اسکی فنی تدبیر کاری میں اب راست کھردرے اور بلند آہنگ رویوں کے بجائے ایسی لطافت، لوچ، نرمی اور تہہ داری پیدا ہو گئی ہے جسے شاعرانہ TREATMENT کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ اور جو نئے افسانے کا مزاج بنتا جا رہا ہے۔

سلطان سبحانی کے ان افسانوں کا سب سے اہم وصف افسانہ کی تکنیک پر قدرت ہے۔ ابتدا سے انجام تک وہ ایک پل کے لئے بھی قاری کو اپنی گرفت سے آزاد ہونے نہیں دیتے۔ وہ اپنے کرداروں کی داخلی لہروں اور ماحول کے درمیان ایسا تال میل اور توازن پیدا کر دیتے ہیں جو قاری کو کچھ نئے زاویوں سے زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ نازک اور معنی آفریں فضا ـــــ ـــــ افسانہ میں آخر تک قائم رکھنے میں افسانہ نگاری کی بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اسے ہر لحظہ اپنی اختراعی قوت کو فعال رکھنا پڑتا ہے۔ نئے سیاق میں لفظوں کی ایک الگ پہچان بنانا پڑتی ہے اور سب سے اہم حسن تعمیر کا ایک ایسا احساس ہے جو قاری کے وجود میں شگوفے کھلاتا ہے اور آخر میں اس پر کسی ایسی سچائی کا انکشاف کرتا ہے جو اس کے اپنے تجربات سے ہم آہنگ ہو یا ایسا احساس دلائے۔ مثلاً گلاب موسم کی سیڑھی' اجتماعی اداروں اور نظریوں کے طوفان میں ڈولتے فرد کی شناخت اور آزادی کا اعلانیہ ہے۔ یہ کشمکش تو اس وقت سے انسان کا مقدر ہے جب سے وہ ایک معاشرے کا حصہ بنا۔ روسو نے سماجی اداروں سے انسانی وابستگی اور انحصار کو اس کی غلامی سے تعبیر کیا۔ اور اسکی آزادانہ نشو و نما کے لئے اسے ان زنجیروں کو توڑنے اور فطرت کے کھلے آغوش میں پناہ لینے کی ترغیب دی۔ آج جب فرد کو اسیر دام کرنے کے لئے نئے مشینی اور معاشی عوامل پیدا ہو گئے ہیں یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار نے اس کے انسانی پہلو کو ایک ارفع سطح سے دیکھا ہے۔

نئے افسانہ کا غالب رجحان علامتی حقیقت نگاری کا ہے۔ حقیقت نگار دنیا کے ہنگاموں کو معروضی حقیقت کے روپ میں دیکھتا ہے۔ وہ انسانی وجود سے باہر حقیقت کے مادی وجود پر یقین رکھتا ہے اور مانتا ہے کہ اس کا جدلیاتی اور تاریخی عمل حیاتِ انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل کی تفسیر اور ترجمانی کے لئے وہ تخلیقی سطح پر اکثر علامت اور استعارہ سے کام لیتا ہے۔ فنکار اپنے تجربہ کی نہج کے مطابق وقت کے بے کنار سمندر میں ہر سمت تیرنے کا پروانہ حاصل کر لیتا ہے۔

'دھنستی ہوئی زمین' اور بعض دوسری کہانیوں میں زمان و مکان تخیل کی کمند کے اسیر نظر آتے ہیں۔ یہاں فنکار نے انسانی ارتقا کی جن المناک حقیقتوں کو موضوع بنایا ہے وہ آج کی سب سے بڑی سچائی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی فتوحات کے بل پر انسان ہلاکت آفریں اسلحہ کے جوا نبار لگا رہا ہے آخر اس کی منزل کیا ہے؟ مستقبل کی عالمی جنگوں کے بعد اگر نسلِ انسانی باقی رہی تو کیا پھر وہ صحراؤں میں حیوانوں اور وحشیوں کی زندگی بسر نہیں کرے گی؟ کیا وہ حجری دور میں واپس نہیں جائے گی؟ یہی وہ سوال ہیں جو ایک جاندار تمثیلی اسلوب میں فنکار نے اٹھائے ہیں۔

ان کہانیوں میں ترسیل کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ قاری اظہار و ادا کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر فنکار کا ہم سفر رہتا ہے۔ بیانیہ، مکالمہ، منظر، مونولاگ سب کو فنکار کا نقطۂ نگاہ کہانی کے تار و پود میں ایک وحدت کا روپ دے دیتا ہے۔

اس مجموعہ کی خوبصورت کہانیوں میں 'میرا کھویا ہوا ہاتھ' ہے۔ اس کی علامتی فضا میں تلازمۂ خیال سے معنی کی لطیف خوشبو اڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف کے طبقاتی احساس نے لاشعور بن کر کہانی کا جال بُنا ہے۔ ہاتھ کی گمشدگی محنت کا ازلی استحصال بھی ہے اور خودکاری، الکٹرانک آلات نیز دوسرے عوامل کے نتیجہ میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا آسیب بھی۔ اس کے پہلو بہ پہلو ہم عصر تہذیب کے حوالے سے کئی دوسرے سوالات بھی جنم لیتے ہیں۔ کہانی کے پیکروں کی تہ میں مزدوروں کی عالمی تحریک کا تعلق بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کہانی کا مرکزی نقطہ دستِ محنت کش کی اسیری سے دور نہیں لے جاتا۔ یہ منظر دیکھئے

'محترم بزرگ۔ میرا ہاتھ بہت قیمتی تھا۔ وہ پتھریلی زمین کے
سینے میں اتر کر چشمۂ آبِ رواں تلاش کرتا تھا۔ وہ سیاہ

چٹانوں سے گفتگو کرتا تھا۔"

......میں دیو پیکر پتھروں کی سلوں میں گھوڑوں کی طرح جُتے
ہوئے لوگوں سے کہتا ہوں۔
"تم نے میرا ہاتھ ضرور دیکھا ہوگا"
وہ رک جاتے ہیں۔ گھوم کر میری طرف دیکھتے ہیں۔ مگر جواب میں
صرف زنجیروں کی آوازیں کھنکھناتی ہیں اور ان پر چابک کے
سفاک قہقہے۔

اس کہانی کے ساتھ "تاریک نخلستان" کو بھی پڑھیئے۔ یہاں بھی ہاتھ محنت اور جد وجہد کی علامت ہیں۔ انسان ازل سے ایک شاداب اور روشن نخلستان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ اس تگ و دو میں کتنے ہی تاریک جنگلوں اور خوفناک گھاٹیوں سے گذرتا ہے۔ صلیب نما عقاب اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اسے ہمیشہ غار کے دوسرے دہانے پر روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ لیکن وہاں پہونچتا ہے تو پھر مایوسی کے اندھیرے گھیر لیتے ہیں۔

"سیاہ و آب آتش پا" آسودگی، مسرت اور عافیت کے لئے انسان کی ازلی آرزو مندیوں اور مسلسل کوششوں کی کتھا ہے۔ وہ داستان کے ہیرو کی طرح ایک طلسم کو فتح کرلیتا ہے تو دیکھتا ہے کہ سامنے دوسرا طلسم اسے للکار رہا ہے۔

ان افسانوں کی دھیمی دھیمی فضا میں کہیں کہیں تصادم، تشدد، تناؤ اور بکھراؤ کے پیکر بیساختہ پیچ بن کر ابھرتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے گرد وپیش کے وحشیانہ حالات سے بے نیاز نہیں۔ احساس کی تلخی اور برہمی کبھی کبھی ہلکے طنز کا روپ اختیار کرلیتی ہے لیکن یہ ایسا تیکھا طنز ہے جس کا رشتہ ظرافت سے نہیں دردمندی سے جڑا ہے۔ اس نوع کی دو کہانیاں "شیشہ سوار شب" اور "چابک بدست امام" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ موخرالذکر کہانی کے بعض گوشے متنازعہ بھی ہوسکتے ہیں اور کچھ قاری یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ افسانہ نگار نے ہمسایہ ملک میں ہونے والے ایک سیاسی قتل کو بے جا اہمیت دی ہے اور مقتول کو شہید یا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔ حقیقت

میں افسانہ نگار کا مسئلہ یہ نہیں ہے (یہ الگ بات ہے کہ اگر وہ اس تاریخی واقعہ کا ذکر زیادہ معروضی اور اشاراتی ڈھنگ سے کرتا تو کہانی کا تاثر بڑھ جاتا) وہ کہتا ہے کہ خود مقتول بھی اسی طرح کے سیاسی قتل و خون کا مجرم رہا ہے اور اس کے ہاتھ بھی خون سے رنگے ہیں۔ لیکن وہ اپنے سیاسی جرائم پر دین و مذہب کا پردہ نہیں ڈالتا۔ وہ کم سے کم ریاکار نہیں ہے۔ جبکہ سبز سورج کے ساتھ طلوع ہونے کا دعویٰ کرنے والے عسکری حکمراں اپنے بھیانک جرائم پر مذہب کی نقاب ڈال لیتے ہیں اور جمہوریت کو قتل کر کے انسانی حقوق کو سفاکی سے روندتے ہیں۔ کہانی میں لطیف طنزیہ اظہار کے بعض پیرائے بے حد دلچسپ ہیں۔ یہ پیکر دیکھئے

'اچانک وردی پوش کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس کے
چہرے میں چھپا ہوا ایک اور چہرہ نمودار ہوا۔ کھڑے ہوئے
کان۔ آنکھوں کے گہرے گڈھوں میں جلتی ہوئی موم بتیاں،
رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور طبوترے چہرے پر وحشیانہ
تناؤ۔

'میں نورِ حق ہوں'

'ماں .... بھیڑیا ۔ ایک بچہ سہم کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

علامتی فضا کی تعمیر کے لحاظ سے "شیشہ سوار شب" زیادہ مربوط اور مکمل کہانی ہے۔ اس کی واقعہ نگاری حرکت، تحیر اور معنی خیز اشاریت سے معمور ہے۔ مصنف قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی افسانہ کے بے نام کرداروں کی طرح اپنے آپ سے سوال کرے۔ آخر وہ کون ہے جو آئے دن گلیوں میں گھروں کے شیشے توڑ کر غائب ہو جاتا ہے، ہزاروں آنکھیں ہیں لیکن اسے دیکھ نہیں پاتیں لاکھوں ہاتھ اسے پکڑ نہیں پاتے۔ وہ کون ہے جس نے امن پسند لوگوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں؟ ہماری آج کی قومی زندگی کے تناظر میں یہ فتنہ فرقہ وارانہ تشدد کے سوا کچھ نہیں۔ ہو سکتا ہے آنے والے ادوار میں یہ کسی دوسرے قومی عذاب کا روپ دھارن کر لے۔ علامتی حقیقت نگاری کی یہی وہ سطح ہے جو کسی تخلیق کو ہر دور کی اجتماعی صورت حال سے جوڑ کر زندہ رکھتی ہے۔

سلطان سبحانی کے ان گنت افسانے ہند و پاک کے موقر و معیاری ادبی رسائل میں

شائع ہو چکے ہیں۔ "ہم زبان" کے مدیر کی حیثیت سے بھی اہلِ نظر ان کی خدمات سے آشنا ہیں۔
پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم عصر اردو افسانہ کے تخلیقی معیار و کردار کو ارفع بنانے میں ان کا
جو حصہ ہے اس کا اعتراف ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ شاید اس کا ایک سبب ان کی طبیعت کا عجز
و انکسار ہے۔ اگر وہ بھی اپنے بعض ہم عصروں کی طرح نام و نمود کے تئیں قید میں آسان اور سستے
ذرائع سے کام لیتے یا کسی "گروہ" سے وابستہ ہو جاتے تو افسانہ کے ناقدین اور اکیڈمیوں کے
کارگزار اپنی فہرستوں میں ان کا نام نمایاں رکھتے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ سنجیدہ اہلِ علم اور
افسانوی ادب کے قدر شناس انھیں زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

تلاش

جنگ کے بعد

جب سب لوگ اپنے اپنے کٹے ہوئے اعضا کو ڈھونڈنے مقام واردات پر پہونچے تو انھوں
نے دیکھا کہ ایک سر بُریدہ شخص کاندھے پر تخت اٹھائے اپنے تاج کو ڈھونڈ رہا ہے۔

میرا کھویا ہوا ہاتھ

پچھلے دنوں بھیڑ میں میرا ہاتھ گم ہو گیا۔

وہ ہاتھ کس وقت گم ہوا کس جگہ گم ہوا، مجھے یاد نہیں البتہ یہ احساس ضرور ہے کہ جب میں بھیڑ سے علاحدہ ہوا تو میرا ہاتھ غائب تھا۔

میں سوچ رہا ہوں کہ جلد از جلد اپنے کھوئے ہوئے ہاتھ کو تلاش کر لوں ورنہ ڈر ہے کہیں وہ ان رنگ بدلتے ہوئے چہروں کے پاس نہ پہونچ جائے جو ہاتھوں کی تجارت کرتے ہیں

اپنا ہاتھ مجھے بے حد عزیز تھا۔

میرا ہاتھ قندیل کی بجھی ہوئی آنکھ کو شعلے کے جسم سے متعارف کراتا تھا۔

میرا ہاتھ رنگین تتلیوں اور چمکتے ہوئے جگنوؤں کے لمس سے نرم و لطیف ریشم بُنتا تھا۔

میرا ہاتھ پتھریلی زمین کے سینے میں اُتر کر چشمۂ آبِ رواں تلاش کرتا تھا۔

میرا ہاتھ بھوری بنجر زمین پر دھانی دوپٹے پھیلا کر اس کو زرخیز شباہت دیتا تھا۔

میرا ہاتھ پتھر اور چقماق کے درمیان شعلے کی تخلیق کا محرک تھا۔

میرا ہاتھ ہواؤں کے پنکھ چھیڑ کر صحراؤں پر بادلوں کی بارات اتارتا تھا۔

میرا ہاتھ سمندروں سے ہمکلام تھا۔

میرا ہاتھ سیاہ چٹانوں سے گفتگو کرتا تھا۔

میرا ہاتھ......

میرا ہاتھ ...... اُف ! اس ہاتھ کے بغیر تو اب میرا اپنا وجود ہی مشتبہ ہو گیا ہے۔ وہ کون سی جگہ ہے جہاں میں نے اسے تلاش نہیں کیا۔ مُردہ خانوں میں ــــ ریستورانوں اور رقص گاہوں میں ــــ زمین دوز مکانوں کی بند الماریوں میں ــــ شریف گھروں کے بٹوؤں میں ــــ فاحشہ عورتوں کے پرس میں ــــ سب جگہ تلاش کیا۔ کہیں بھی اس کا پتہ نہیں ہے۔ اب تک سارے لوگوں سے پوچھ چکا ہوں مگر کسی کو بھی میرے گم شدہ ہاتھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میں شہر کے ایک بڑے چوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہوں۔

اگر وہ ہاتھ نہیں ملا تو میں ادھورا رہ جاؤں گا۔ میرے سارے کام رک جائیں گے۔ جو لوگ مجھے پہچانتے ہیں' جو مجھ سے ملتے ہیں وہ سب عہدِ فراموش کی طرح بہت دور چلے جائیں گے میری شناخت میرے چہرے سے نہیں' میرے ہاتھ سے ہے۔ یہ قندیل' یہ پتھر' یہ شعلہ یہ ریشم' یہ آبِ رواں' یہ دھانی دوپٹے' یہ سمندر' یہ زمین یہ ہوا' یہ سب میرے ہاتھ کے بغیر نقطۂ سکوت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ان سب میں حرکت اور حرارت میرے ہاتھ کی وجہ سے ہے۔ میرا ہاتھ سیروں کا جگمگاتا ہوا شہر ــــ میرا ہاتھ مٹی کا تاج محل۔ لیکن اب تو مجھے خود اپنی بھی فکر ہے کہ بغیر ہاتھ کے میں زندہ کس طرح رہوں گا۔ یہاں تو وہ لوگ رہتے ہیں جن کے پاس ہزار ہزار ہاتھ ہیں۔ لیکن سب کے سب ہر وقت جیبوں میں گھسے رہتے ہیں۔ جیبوں میں گھسے ہوئے ہاتھ' بے مصرف' بے کار۔ ایسے ہاتھ سیاہ چٹانوں سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ بارود کو برف یا پھول نہیں بنا سکتے۔

ایک خوش لباس آدمی ایک وزن دار بریف کیس لئے پاس سے گزرتا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں۔

"سنئے! آپ نے میرے ہاتھ کو کہیں دیکھا ہے ؟"

وہ رک کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس حالت میں مجھے اس کی آنکھیں

ان کے اپنے صحیح مقام پر نظر نہیں آتیں میں وضاحت کرتا ہوں۔

"میرا ہاتھ گم ہو گیا ہے بھائی۔"

"تو آپ اس کی رپورٹ پولیس اسٹیشن میں درج کرا لیجئے۔"

اور وہ اپنا بریف کیس لئے سامنے آکر رکی ہوئی ایک بس کی طرف لپکتا ہے۔ مگر بس آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ غصہ میں گھوم کر میری طرف دیکھتا ہے۔ میں بھی آگے بڑھ جاتا ہوں۔

ہال کے ایک گوشے میں ایک خالی میز پر بیٹھ کر جب میں چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہوں تو نظریں سامنے ایک کھلے ہوئے گلابی گریبان میں اُلجھ جاتی ہیں۔

وہ اُٹھ کر قریب آتی ہے۔ سفید سفید پنڈلیاں؛ ذرا دیر تک گلابی لہریئے۔ ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ سامنے بیٹھ کر وہ بڑے پیار سے کہتی ہے۔

"اکیلے ہو؟"

"ہاں" ـــــ میری نظریں اس کے کھلے ہوئے گریبان سے گذر کر اس کے خوبصورت ہاتھوں پر جا پڑتی ہیں۔

"بہت اداس لگ رہے ہو؟"

"ہاں ـــ بہت۔"

"کہیں چلو گے؟"

"نہیں ـــ دل نہیں چاہتا۔"

"تمہارے سارے درد دور کر دوں گی۔" وہ مسکراتی ہے۔

میری نظریں اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے لگتی ہیں۔ پھر میں کچھ کشمکش کے سے عالم میں کھڑا ہوتا ہوں۔

"اچھا چلو۔"

وہ میرے ساتھ ہال سے باہر آجاتی ہے۔

"ایک بات کہوں؟" میں چلتے چلتے رک جاتا ہوں "میرا ہاتھ گم ہو گیا ہے۔ تم نے اسے

کہیں دیکھا ہے ؟" وہ چونک اٹھتی ہے ۔ گلابی لہریوں سے بے شمار چیخیں سی بلند ہوتی ہیں ...... پھر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بہت قریب آجاتی ہیں ۔ ان کی ٹاپوں کی مسلسل آواز سے درختوں کے پتے لرزنے لگتے ہیں ۔ فضا مرتعش ہوجاتی ہے ۔ میں دیکھتا ہوں غبار کی ایک متحرک دیوار سی چلی آرہی ہے اور سارا دشت اس غبار کی زد میں ہے ۔ پھر غبار کے ساتھ ہی ہزاروں کالے اور سفید گھوڑے قریب سے گذرنے لگتے ہیں ...... تلواریں' نیزے' بھالے زرہ بکتر' پرچم' نعرے' ڈھال اور ان سب کے درمیان سے گھورتی ہوئی آنکھیں ۔

میں چلّاتا ہوں "سنو سپاہیو سنو !"

مگر میری طرف ایک آنکھ بھی نہیں اٹھتی ۔ میں اور زور سے چیختا ہوں ۔

"سپاہیو سنو ! تم نے میرے ہاتھ کو کہیں دیکھا ؟ اُدھر کہیں تمھیں میرا ہاتھ نظر آیا ؟"

لیکن غبار کی دیوار سب کو سمیٹ کر بہت دور لے جا چکا ہے اور دشت میں ہر طرف میرے سوالات ہی گونجتے رہ گئے ہیں ۔ شاید میرے ہاتھ کو کسی نے نہیں دیکھا ۔

"...... اور لوگو ! ایک اونچی چٹان پر کھڑے ہو کر میں نہایت زور سے کہتا ہوں ۔

"کیا تم نے بھی میرے ہاتھ کو نہیں دیکھا ؟"

سب میری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں ۔ میں پھر کہتا ہوں ۔

" آخر تم لوگ میری بات سمجھتے کیوں نہیں ۔ میں نے تم لوگوں کو کتنی مشکل سے یہاں جمع کیا ہے ۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ میرا ہاتھ گم ہوگیا ہے ۔ اگر تم میں سے کسی نے بھی میرے ہاتھ کو کہیں دیکھا ہو تو مجھے بتلا دے ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اپنے ہاتھ کے بغیر میں نامکمل ہوں ۔ یاد رکھو میرا نامکمل ہونا تم سب کی موت ہے ۔ تم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا ـــ ہاں !"

مگر ہجوم میں سے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا ۔ سب پہلے تو خاموش رہتے ہیں پھر چہرے پر ناگواری کا تاثر لئے جانے لگتے ہیں ۔ تو کیا میرے ہاتھ سے کسی کو ہمدردی نہیں ؟

سڑک کے کنارے صدیوں پرانی زنبیل لے کر کھڑے ہوئے بوڑھے کو میں نہایت پُر امید نظروں سے دیکھتا ہوں ۔ اس نے ضرور میرے ہاتھ کو دیکھا ہوگا ۔

" محترم بزرگ ! میرا ہاتھ گم ہوگیا ہے ۔ آپ نے کہیں دیکھا اُسے ؟"

بوڑھا میری طرف بیزاری سے دیکھتا ہے "تمھارا ہاتھ کھو گیا ہے؟"

"ہاں"

"میری تو ٹانگ کھو گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک رات شہر میں...... بہت سے دھماکے..... ہوئے تھے..... لوگ اپنے اپنے مکانوں سے.... نکل بھاگے تھے..... میں بھی بھاگ رہا تھا..... کہ ایک دھماکہ ہوا....."

بوڑھے کی آواز جیسے بہت دور چلی گئی۔

"محترم بزرگ۔ میرا ہاتھ بہت قیمتی تھا۔ وہ پتھریلی زمین کے سینے میں اتر کر چشمۂ آب رواں تلاش کرتا تھا۔ وہ سیاہ چٹانوں سے گفتگو کرتا تھا۔ وہ...... محترم بزرگ آپ سن رہے ہیں نا؟"

میں دیوپیکر پتھروں کی ہلوں میں گھوڑوں کی طرح جُتے ہوئے لوگوں سے کہتا ہوں۔

"تم نے میرے ہاتھ کو ضرور دیکھا ہوگا۔"

وہ رک جاتے ہیں گھوم کر میری طرف دیکھتے ہیں۔ مگر جواب میں صرف زنجیروں کی آوازیں کھن کھناتی ہیں اور ان پر چابک کے سفاک قہقہے۔

میں دیکھ رہا ہوں

پتھروں کی سلیں بہت دور جا چکی ہیں۔ ان پتھروں میں جانے کتنے ادوار کی تاریخ دفن ہے جانے کتنی صدیوں کی کہانی محفوظ ہے۔ ان پتھروں نے ضرور میرے ہاتھ کو دیکھا ہوگا مگر وہ اسوقت بولیں گے جب محل مکمل ہو جائے گا۔ اور مکمل ہونے کے بعد ہر محل کی آواز دیں قید ہو جاتی ہے۔ باہر کے درد سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہتا۔

باہر عورتوں، مردوں اور بچوں کا بہت لمبا جلوس ہے۔ وہ نا معلوم کون سے نعرے لگا رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں وہ۔ مجھے خبر نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ انھیں بھی کسی چیز کی ضرورت ہے وہ بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ کاش وہ ایک نعرہ میرے ہاتھ کے بارے میں بھی لگا دیں۔ مجھے ان سے پوچھنا چاہیئے۔ ان ہزاروں لوگوں میں سے کسی کو میرے ہاتھ کی ضرور خبر ہوگی۔

میں ان سے پوچھتا ہوں۔

مگر میرے سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

جلوس آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے ——— امید ٹوٹ چکی ہے ——— دل بھر آیا ہے

اور میں چوراہے پر ایستادہ، آتے جاتے ہوئے لوگوں سے پوچھ رہا ہوں

"تم نے میرے ہاتھ کو دیکھا؟"

"تمہیں کہیں میرا ہاتھ نظر آیا؟"

اور اچانک خود میری نظر اپنے ہاتھ پر جا پڑتی ہے۔ خوشی کی ایک بلند چیخ آس پاس کھڑی ہوئی بلڈنگوں سے ٹکرا جاتی ہے۔ میں اپنے ہاتھ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔

میرا ہاتھ اُس بوڑھے خمیدہ آدمی کے پاس ہے جو سر پر ایک بہت بھاری بوجھ لئے سامنے والی تاریک گلی میں داخل ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔

میں لپک کر اس کے پاس پہونچتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلدی سے اس سے اپنا ہاتھ چھین لوں مگر ٹھٹھک کر رک جاتا ہوں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے زیادہ اس بوڑھے خمیدہ اور بھاری بوجھ والے آدمی کو میرے ہاتھ کی ضرورت ہے۔

۔۔۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں۔

میرا ہاتھ مجھ سے جدا نہیں ہوا ہے، اب بھی میرے پاس ہی ہے اور وہ اب بھی سیاہ چٹانوں سے گفتگو کر رہا ہے۔

چابک بدستِ امام

جزیرے میں وردی پوش خود ساختہ امام نے سر ابھارا۔

اور اس نے اپنا چابک فضا میں لہرا کر جزیرے والوں سے یوں خطاب کیا۔

"اے لوگو! میں مسیح ہوں"۔۔۔۔۔

"بدنہاد۔۔۔ بدکردار ۔۔۔ بدہئیت!" پورا جزیرہ چیخ اٹھا۔

اس نے اپنا خطاب جاری رکھا

"لوگو! اس وقت پورا جزیرہ میرے محاصرے میں ہے۔ میں تمہیں راہِ راست پر لے
نے کے لئے ظاہر ہوا ہوں۔ مجھے پہچانو! اگر تم لوگوں نے مجھے اپنا امام تسلیم کر لیا تو میرے
از سے اس جزیرے میں ایک سبز سورج طلوع ہوگا جو تمہاری بے شباہت نہ جلتوں کو
بالیوں سے ڈھانک کر ثمر بار کر دے گا۔ یہ چابک دیکھ رہے ہو۔ یہ اژدر ڈوتا سے مشابہ ہے۔
ک قدرت ہے کہ یہ برق کی طرح لپکتا ہے اور انسانوں کی کھال پھاڑ کر ان کی ہڈیوں پر میرا نام
کر انھیں میری بیعت میں لے آتا ہے۔ یہ چابک ہی دراصل تمہارا نجات دہندہ ہے۔ اسے
لو! اور اپنے اس پاسباں کو بھول جاؤ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تمام بکھرے ہوئے
روں کے درمیان اتحاد کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ اتحاد کی علامت وہ نہیں بلکہ
ہوں۔ یہ چابک گواہ ہے۔ تمہارا وہ پاسباں تو موجِ ریگ کی مانند ہے جو اس وقت میری قید

میں پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہا ہے۔"

"منافق! انسانوں کے دور تک پھیلے ہوئے کوہ ندا میں بازگشت ہوئی۔" تم یہاں یزیدیت لے کر نمودار ہوئے ہو۔ وہ سبز سورج تو صدیوں پہلے طلوع ہو چکا ہے۔ تم کس سورج کی بات کر رہے ہو؟ سبز سورج کے نام پر تم نے پورے جزیرے میں بارود بچھا دیا ہے۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔"

اچانک وردی پوش کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اس کے چہرے میں چھپا ہوا ایک اور چہرہ نمودار ہوا۔ کھڑے ہوئے کان، آنکھوں کے گہرے گڑھوں میں جلتی ہوئی موم بتیاں، رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں اور لیموترے چہرے پر وحشیانہ تناؤ۔

"میں خود حق ہوں۔"

"ماں..... بھیڑیا" ایک بچہ سہم کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

"احسان فراموش!" کوہ ندا بپھر گیا۔ "خود حق بننے سے پہلے اپنی سیاہ کاریوں کا حساب دو۔"

اچانک وردی پوش کی آنکھوں میں جلتی ہوئی موم بتیاں سُرخ ہو گئیں اور اس کے دائیں بائیں سے بہت سارے فوجی بُوٹ نکل کر کوہ ندا کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک شور اٹھا اور کوہ ندا منتشر ہو گیا۔ لیکن اپنے پیچھے کچلی ہوئی لاشیں چھوڑ گیا۔

وردی پوش نے فخر سے کہا۔

"سبز سورج طلوع ہو چکا ہے۔ اب پاسباں کے حواریوں کے ہاتھ کاٹنے کا موسم شروع ہوگا۔ اب ان کے ہاتھ مغرب کے تاجروں کو تحفتاً دئے جائیں گے۔ اب یہ چابک پورے جزیرے پر لہرائے گا کیوں کہ اپنے آپ کو تسلیم کروانے کے لئے ہر طرح کی طاقت کا استعمال جائز ہے اور بغاوت کا علاج صرف بربریت!

پورا جزیرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

کہیں کہیں صرف فوجی بوٹ روشن تھے اور گنگنا بھی رہے تھے۔

اس تاریکی میں آہنی سلاخوں کے پیچھے میں موت کے قدموں کی آواز سن رہا ہوں۔

میرے جسم سے ایک شاخ پھوٹ نکلی ہے جس کے سرے پر ایک پتی شمع کی طرح روشن ہے پوری کوٹھری میں بس اتنا اُجالا ہے۔ میں بیمار ہوں میرے دانتوں سے خون رس رہا ہے جس نے اس جزیرے میں شادابی کی لہر دوڑا کر اسے شاندار مستقبل سے ہمکنار کر دیا تھا۔ یہ شاخ گواہ ہے کہ یہ خون وہ ہے جس نے اس جزیرے کے بازو، گولیوں، فوجی بوٹوں اور زنجیروں سے نجات دلائی تھی۔ یہ خون وہ ہے جو ہمیشہ نسلِ آدم کی خدمت میں مصروف رہا ہے لیکن آج اس پر تہمت دھری گئی ہے...... یہ شاخ مجھے کب تک سنبھالے گی ......یہ پتی کب تک روشن رہے گی؟ شاید ہمیشہ ـــــ میرے بعد بھی۔

مجھے پیاسا مارا جا رہا ہے۔ ہر طرح کی اذیت دی جا رہی ہے۔ کھانا، پانی، دوا، بستر وغیرہ ہر چیز سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس بیماری میں بھی وزنی دار بوٹوں سے کچلا جا رہا ہے۔ طرح طرح سے خوفزدہ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نفسیاتی حربوں کے تمام جلوس نکال دیئے گئے ہیں۔ ہر رات اس کوٹھری سے باہر قبر کھودی جا رہی ہے۔ تاکہ میں گھبرا کر خودکشی کر لوں۔ یا اس منافق اور ظالم کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں۔ یہ ناممکن ہے۔ جب تک یہ شاخ مجھ پر سایہ فگن ہے مجھ میں حوصلہ رہے گا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ظالم فاتح ہوا ہو....... وادیٔ نیل...... مقامِ گلگتا....... سرزمینِ فرات! اس شاخ کو تازگی دے اسے سنبھال۔ یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

سبز سورج کے نام پر پورے جزیرے میں دھول اڑا دی گئی۔

جب سب کی آنکھوں میں دھول بھر گئی تو شاہراہوں پر چابک برسنے لگے۔ قید خانوں کو آباد کیا جانے لگا۔

"لب کھولنا جرم ہے، سچ کہنا جرم ہے۔ کچھ لکھنا جرم ہے۔" اِن احکامات کے پیچھے سازشوں کا ایک بہت لمبا جلوس پھیلتا، پھیلتا ہوا بہت دور تک چلا گیا تھا جس کا آخری سرا دیارِ مغرب میں سجدۂ شکر ادا کر رہا تھا۔ ایک لازوال سجدہ ـــــ جس میں چالیس لاکھ ڈالر کی خوشبو تھی۔

وردی پوش کی حاشیہ بردار خونی جماعت کے سربراہ کا سینہ نُور سے بھر گیا۔

"اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں...... لیکن سر سبز سورج تو طلوع ہو چکا ہے۔

مساوی حقوق! تجھے آخری سلام۔ اب محمود کی صف میں جو بھی ایاز آئے گا اسے کچل دیا جائے گا یہاں نظام یکسر سبز ہے۔

مشتہر کردہ جماعتی نظام اور اس کا نقطۂ سفر لہو کے بھنور سے ذرا آگے بڑھا تو جزیرے میں خوف و ہراس، احتجاج اور تشدد تصادم ہو گئے۔

وردی پوش نے پیر مونچھوں کے تحرک میں خطاب کیا۔

"مجھے پہچان لو۔ میں چابک والا ہوں۔ میری اطاعت قبول کرو۔ خونی جماعت کا سربراہ بھی مجھ پر ایمان لا چکا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس چابک کی وجہ سے جزیرہ کتنا سرسبز ہو گیا ہے میں اس جزیرے کا سب سے رحم دل اور با اصول انسان ہوں۔ مطلق العنانی میرا شیوہ نہیں معاندت، اقتدار کی ہوس، انتقام، جھوٹی شہرت، سازش، دھوکا، ظلم، بربریت، قتل و خون یا ایسی کسی بھی کمزوری سے میں سراسر پاک اور مبارک ہوں۔ تمہارا پاسباں ایک انتہائی ظالم انسان ہے وہ ایک سیاسی قتل کے الزام میں ماخوذ ہے۔ بے انتہا غلطیوں کا مرتکب ہے اور اب اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کو اپنی اپنی غلطیوں کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ خواہ وہ عیسیٰؑ ہو، سقراط ہو، یا منصور ہو ـــــ تمہارے پاسباں نے اگر مجھ پر اعتماد کیا۔ مجھے ترقی دی تو کیا ہوا، جسے تم لوگ خونی جماعت کا سربراہ کہتے ہو اسے بھی تمہارے پاسباں نے پھانسی کے پھندے سے بچایا تھا۔ تو کیا یہ کوئی کارنامہ ہو گیا! آخر ہم لوگ بھی تو اپنا عظیم انسانی فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہم انصاف پسند ہیں۔ انصاف ہمارا ایمان ہے۔ یہ جزیرہ اگر آج بارود کی وجہ سے آتش فشاں بن گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ ممکن سبز موسم چلنے پر گلزارِ ابراہیم میں بھی بدل سکتا ہے۔ لیکن تم لوگ اتنے خاموش کیوں ہو؟ اتنے خشک اور بدمزہ کیوں ہو گئے کیا میرے خطاب نرم و نازک کا تم پر کوئی اثر نہیں؟"

لوگ گھروں سے باہر نکل آئے

اداس لوگ، فکرمند لوگ، آنسو والے لوگ، غصہ والے لوگ اور جب وہ سب آپس میں ملے تو وہاں ایک مینار بلند ہو گیا کروڑوں آنکھیں ـــ کروڑوں ہاتھ ـــــ اور کروڑوں دل۔

وردی پوش کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا شبہ جھلکا۔ اس نے دیکھا کہ مینار کی سب
سے بلند منزل پر جزیرے کا پاسبان کھڑا ہوا ہے اور اس کے سر پر ایک شاخ سایہ فگن ہے۔
وہ غصے میں بھڑک اٹھا ــــــ "جزیرے والو! اسے اپنی آنکھوں اور دلوں سے
نیچے اتار دو۔ یہ ظالم ہے۔ مجرم ہے۔ ورنہ یہ چابک دیکھ رہے ہو......"
مینار سے آواز آئی "ظالم اور مجرم تم ہو۔ تم سبز سورج اور سبز موسم کے نام پر سب کو
سبز باغ دکھا رہے ہو' سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو۔ تم نے اقتدار کی ہوس اور
انتخابی انتقام کی آگ میں جل بھن کر پاسبان کو بے گناہ پھانسا ہے۔ تم نے اور تمھاری طوفانی
جماعت نے سبز سورج کی پرستش کی بجائے اس کے ہزار ٹکڑے کر دیے ہیں۔ تم نے اس جزیرے
پر سبز موسم نہیں بلکہ سبز کفن ڈال دیا ہے لیکن تمہیں علم ہونا چاہیئے کہ یہ بارود' یہ چابک' یہ فوجی
بوٹ حق کو کبھی نہیں مٹا سکتے۔ بد دماغ! تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ عیسیٰ' سقراط یا منصور غلطی
پر تھے۔ کیا اس طرح تم اپنے داغ دھو سکو گے؟ ظالم تم سردار کاہن کی نسل سے تعلق رکھتے ہو۔ اس
جزیرے پر نمرودیت پھیلانے کے بعد گلزار ابراہیم کی بات کر رہے ہو۔ اس خطبے سے تو اسی طوفانی
جماعت کے انداز نگارش و بیان کا پتہ چلتا ہے جس نے ہمیشہ اپنی ہی قوم میں فساد کھڑا کیا ہے۔
جس نے ہمیشہ اپنی ہی قوم کے لوگوں کو کٹوایا اور جس نے ہمیشہ اپنی ہی قوم کے خلاف سازش کی۔
وردی پوش کی آنکھیں سرخ ہو گئیں' اس نے چابک لہرا کر کہا۔
"گستاخی بند کرو! میں اس جزیرے کا حاکم اور تم سب کا امام ہوں اگرچہ داڑھی سے مجھے
کوئی دلچسپی نہیں۔ امام تو میں بہرحال ہوں۔ میں جدید شریعت کا حامی ہوں۔ یاد رکھو! مجھ سے
انحراف کا انجام تم سب کے لئے موت ہے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ ملک کا حاکم خدا ہوتا ہے۔"
مینار سے آوازیں اُبھریں۔
"تم جیسا خود ساختہ خدا نیل میں غرق ہو جاتا ہے۔ آگ میں جل کر خاک ہو جاتا ہے اور پتھروں
میں دب کر دفن ہو جاتا ہے۔ تمھاری خدائی پر آخ تھو!"
مینار پھیل گیا اور پانی کی لہروں کی طرح لچکتا ہوا شاہراہوں پر شور کرنے لگا۔ احتجاج۔ احتجاج!
...... اور رات میں جب سارا جزیرہ سو گیا تو فوجی بوٹ گلیوں میں پھیل گئے اور سوتے ہوئے

لوگوں کو چُن چُن کر سلاخوں کے حوالے کرنے لگے ۔ پسِ سلاخ بھی احتجاج ۔

ساری دنیا کی نظر جزیرے پر مرکوز ہو گئی ۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایک قیدی کو بچانے کے لئے پوری دنیا حرکت میں آگئی ۔ اتنا عظیم قیدی کہ تاریخ بھی حیران ۔ یہاں تک کہ دیارِ مغرب سے بھی نامہ و پیام چلے ۔ شاہوں کے بھی کاغذی گھوڑے دوڑے ۔

اور گھوڑے ہنہناتے ہوئے وردی پوش کے بارود خانے میں گھس گئے ۔

اس نے دیکھا ہر گھوڑے پر ایک پاسبان بیٹھا ہوا ہے جس کے سر پر ایک شاخ ہے جو تلوار کی طرح چمک رہی ہے ۔ وہ خوفزدہ ہو گیا ۔ پھر اسے اپنے چاروں طرف پاسبان کی بھیڑ نظر آنے لگی ۔ اور ایک چمکتی ہوئی تلوار ۔

قریب ہی ایک دوسرے جزیرے میں ایک بوڑھی عورت کچھ بچوں کو ایک ظالم بادشاہ کی کہانی سنانے کے بعد کہنے لگی ـــــ " تو بچو ! جو سب کی نیند حرام کر دیتا ہے وہ خود بھی نیند کو ترس ترس جاتا ہے ......"

میں سلاخوں کے پیچھے زخم اور تکلیف سے بدحال پڑا ہوں ۔ ابھی کچھ دیر پہلے کچھ وردی پوش بھیڑیئے چابک لے کر مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے ۔ مجھے ختم کرنے کی کتنی کوششیں جا چکی ہیں ۔ میرے جسم سے چالیس کلو خون اور گوشت کم کر دیئے گئے ہیں ۔ اس تنگ سی کوٹھری میں بھی مجھے وزندار فولادی زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا ہے ۔ ایک بیمار کے ساتھ اتنا بہیمانہ رویّہ ۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا جو ہمیشہ مسیحا کے ساتھ ہوتا رہا ہے ۔ جھوٹے مقدمے ' جھوٹی شہادت ' جھوٹے گواہ ۔ انصاف کو ختم کرنے کے لئے کیسے کیسے اہتمام کئے گئے ہیں ۔ وہ حاکم ہونے کے باوجود آج ایک فقیر سے بھی بدنصیب ہے کہ میرے سامنے رحم کا کشکول لے کر کھڑا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے کشکول میں سے تھوڑا سا رحم میں اپنے لئے مانگ لوں ۔ کتنا محتاج ہے وہ میرے سامنے ۔ شاید دنیا کو اپنی اداکاری دکھلا رہا ہے ۔ میں جانتا ہوں مجھے دار پر چڑھا دیا جائے گا ۔ میری سانسوں کی طناب توڑ دی جائے گی لیکن میں تو کروڑوں دلوں میں زندہ ہوں ۔ یہ شاخ گواہ ہے

کردابوں میں پھنسے ہوئے لوگ کبھی نہیں مرتے۔

.......اور شاخ نے دیکھا کہ خونی جماعت کے سربراہ کے ایک حاشیہ بردار نے بارگاہ خانہ میں حاضر ہوکر وردی پوش کو سلامی دی' سجدہ کیا اور فضا میں انگلی سے ایک نشان بناکر سربراہِ خونی جماعت کا ایک قطعی فیصلہ پیش کیا۔

وردی پوش کے چہرے میں چھپا ہوا دوسرا چہرہ اُبھر آیا اور آنکھوں میں جلتی ہوئی موم بتیاں سُرخ ہوگئیں۔ اور وہ اتنے زور سے ہنسا کہ پس چہرہ ایک تیسرا چہرہ بھی وجود و ظہور میں آگیا۔

مجھ سے میری آخری خواہش پوچھی گئی ہے لیکن رحم کی بھیک لے کر کھڑے ہوئے دریوزہ گر کو میں اپنی آخری خواہش سے بھی محروم رکھوں گا۔ سچائی' بے گناہی اور انصاف کو قتل کرنے والے اس بے رحم سفاک کی آخری خواہش بھی پوری ہونے نہیں دوں گا۔ میں جھوٹ' فریب اور ظلم سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اے شاخ......اب میں رخصت ہونے والا ہوں' تو اس جزیرے کو اپنی پناہ میں لے ......ایک مظلوم انسان اپنا اثاثہ جو کروڑوں انسانوں کی شکل میں ہے تجھے سونپ رہا ہے۔ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اب مجھے مار ڈالیں گے......

کانوں میں اذان کی آواز گونجنے لگی۔

"اللہ اکبر اللہ اکبر... اللہ اکبر اللہ اکبر

اشہد ان لا الہ الا اللہ......"

اور جزیرے کے ایک گوشے میں شمع کے نیچے بائبل کا ایک ورق ہوا سے پھڑپھڑانے لگا۔

"اور سردار کاہن اور سب صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے لیے اس کے خلاف گواہیاں ڈھونڈنے لگے' مگر نہ پائیں' کیوں کہ بہتیروں نے اس پر جھوٹی گواہیاں تو دیں لیکن انکی گواہیاں (آپس میں) متفق نہ تھیں"

میں شانخ سے کہہ رہا ہوں۔
یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی ......

اور یہ دنیا کا پہلا واقعہ تھا کہ سورج رات کے ڈھائی بجے ہی طلوع ہو گیا۔ ایک سفید چمکتا ہوا گھوڑا ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور ایک بچے کو سمیٹ کر جزیرے سے بلند ہو گیا۔ کوٹھری خالی ہو گئی۔ اور یہ دنیا کا پہلا اتفاق تھا کہ کسی کے گھر میں موت ہو گئی اور میت کی خبر سات سمندر پار سے آئی۔

"ذرا اپنے گھر میں دیکھو، تمہارا کوئی عزیز چل بسا ہے ......"

"........ دنیا کا سب سے ذلیل اور بدترین واقعہ ...."
لوگ چیختے ہوئے، روتے ہوئے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے۔
پورا جزیرہ رونے کی آوازوں سے گونج گونج اٹھا۔
شاہراہوں پر جگہ جگہ کوہ آتش فشاں کھڑے ہو گئے۔
"وردی پوش کتے! کیا یہی ہے تمہارا سبز سورج؟ تم نے اتنا ظلم کیا ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی: بھیڑیئے، تم نے دنیا کے تمام امن پسند انسانوں کا کلیجہ پھاڑ دیا ہے۔ ایک بیگناہ پر مسلسل ڈیڑھ سال تک ظلم کرنے کے بعد اسے رات کے اندھیرے میں اس طرح مار ڈالا کہ کسی کو خبر تک نہ ہو سکی۔ اتنا بڑا دھوکہ، اتنی بڑی سازش۔ ذلیل کتے کیا یہی ہے تمہارا نظام سرسبز۔ ظالم تم نے کسی ایک فرد کو نہیں، بلکہ پوری ایک نسل کو پوری ایک قوم کو قتل کر ڈالا۔ مگر لوکریہ خون ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔"
گھروں سے عورتیں اور بچے بھی نکل آئے۔
روتے، بلکتے اور ذبح کئے ہوئے پرندوں کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے لوگ۔
اچانک ہر طرف سے دندناتے ہوئے فوجی بوٹ اور چابک حملہ آور ہوئے اور ماتم کرنے والوں کی کھالیں ادھڑی جانے لگیں ......

ایک بوڑھے عیسائی نے اپنے کمسن بیٹے سے کہا۔
"اور بیٹے! یسوع کو گرفتار کرانے کے صلہ میں اس کے شاگرد یہوداہ کو صرف تیس روپئے ملے تھے۔"

وردی پوش نے کہا۔
"میں حق پر ہوں۔ میں نے سب کچھ صحیح کیا ہے۔ اس جزیرے پر اب مکمل سبز نظام چھا چکا ہے...... وہ دیکھو ایٹم بم اور میزائیل ہماری طرف پیش قدمی کر رہے ہیں......
میں مر چکا ہوں لیکن دیکھ رہا ہوں کہ میری قبر کے گرد سنگینیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔
چاروں طرف باوردی بدن ایستادہ ہو گئے ہیں۔ صحیفۂ آسمانی کی تلاوت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ میدانوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں تاکہ کوئی سجدہ نہ کرے ورنہ میری روح کو ثواب پہونچے گا۔ یہ نظام سبز نہیں اس کا سفاکانہ قتل ہے۔
لوگ غم و غصہ میں پاگل ہو گئے...... ایک تیز آگ سڑکوں پر دوڑنے لگی۔
ان گنت عمارتوں اور دفاتر کو جلا کر خاک کر دیا گیا۔

" وردی پوش امام! اب تیرا انجام ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اب ہم تجھے چین سے جینے نہیں دیں گے۔ ہماری راہ میں جو بھی حائل ہوگا اسے خاک کر دیں گے۔ یہ طوفان اب رک نہیں سکتا۔ بڑھتا رہے گا، پھیلتا رہے گا۔ یہ طوفان وہ ہے جس کا دوسرا نام عوام ہے اور اب تیرا مقدمہ ہملے ہاتھ میں ہے۔"

جزیرے سے ہزاروں میل دور ایک ماں اپنی بچی کو صدیوں پرانی جنگوں کے واقعات اور معرکے سنا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک تلوار کا تعارف کرایا۔
"بیٹی! حضرت علیؓ کی تلوار کا نام ذوالفقار تھا جو ہمیشہ ظالموں کی صفیں الٹتی رہی...... اور شاید ابد تک ظالموں کے تعاقب میں رہے گی۔"

دھنستی ہوئی زمین

...... ہاں ـــ میں برق سوار ہوں ۔
مستقبل میرا طواف کرتا ہے ۔
لمحے مجھے سجدہ کرتے ہیں ۔

اور میں وقت کی ساری فصیلوں کو توڑ کر صدیوں بعد آنے والے زمانوں کے درمیان سے گزرنے کی اوار رکھتا ہوں ۔" وہ اپنے سفر کے درمیان سوچ رہا ہے ۔

" سندباد ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں ۔ میں کوئی مہم جو تو نہیں لیکن مجھ میں روشنی اور سندباد دونوں کی بہت سی خصوصیات موجود ہیں ۔ یہ سمندر، صحرا اور ہوا کیا ' زمین کی گردش بھی میری تیز رفتاری پر حیران ہے ۔ یہ عہد وہ ہے کہ اب زمین اور آسمان کے سارے فاصلے مٹ چکے ہیں ۔ تمام ستارے اور سیارے مسخر ہو چکے ہیں اور لگتا ہے کائنات گھر کے آنگن سے زیادہ وسیع نہیں ہے ۔ مشینوں نے پوری دنیا کو جیسے ایک طلسم خانہ بنا دیا ہے اور میں اس طلسم خانہ کا ایک تیز رفتار مسافر ' کر وقت سے پیش پیش اپنے سفر میں ہوں اور میرا سفر مستقبل کی دھند میں روشنی کی ایک تیز لہر کی طرح رواں ہوتا جا رہا ہے ...... آگے طوفان ہے ۔"

" یہ کون سی جگہ ہے ؟ " وہ اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے ۔

ہر سمت آگ ' دھماکے اور شور ـــ تا حد نظر گولے پھٹ رہے ہیں اور ساپر بمبار طیارے جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا ہے ۔ زمین کے چیتھڑے اڑ رہے ہیں ۔ ریلوے لائنیں ' بجلی کے کھمبے ' عمارتیں ' پل سب کچھ روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہیں ۔ نیچے دندناتے ہوئے ٹینک اور سر پر مہیب عفریت .... شہر کے شہر تباہ ہوتے جا رہے ہیں ۔ فوجی

سرحدیاں مار رہی ہیں۔ گولیوں کے طوفان میں لاشوں کے انبار لگ رہے ہیں۔ کوئی بھی کیمپ سلامت نہیں۔ ساری فضا زہریلی ہو چکی ہے۔ شاید جدید اسلحوں کا استعمال جاری ہے۔ اوپر طیارے بھی یکے بعد دیگرے پھٹتے جا رہے ہیں۔ ہر سمت بھاگ دوڑ اور شور ہے۔ جان بچا کر بھاگنے والوں کے گوشت کے لوتھڑے آہنی تاروں میں لٹک رہے ہیں۔ بچے پگھلے ہوئے پڑے ہیں۔ پھولوں کی کوئی بھی کیاری سلامت نہیں۔ اسلحوں کے ذخیرے، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں دھماکوں کی زد میں ہیں۔

"لگتا ہے میں تیسری جنگ عظیم کی سرحد پر ہوں۔" وہ سوچتا ہے۔ "مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیئے ورنہ کوئی بم مجھے بھی آگ کے چیتھڑوں کی طرح اڑا دے گا۔ کتنی بھیانک جنگ ہے یہ۔ اوپر بھی جنگ جاری ہے۔ خلائی اسٹیشن تباہ ہو رہے ہیں۔ سمندروں میں بھی آگ لگ گئی ہے۔ جہاز جل رہے ہیں۔ کہیں بھی کوئی محفوظ نہیں۔ اے جنگ عظیم! تجھے سلام' کرستاروں سے آگے پرواز کرنے والا انسان ایک بار پھر زمین کے اندر دھنس گیا۔"

چند فوجی اسٹین گن لیے حملہ آور کے انداز میں آتے ہیں اور اسے اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔

"کون ہو تم۔ ہماری سرحد میں کیسے داخل ہوئے اور تم کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟"

وہ کچھ سوچ کر کہتا ہے۔ "ان گولیوں اور بموں نے تو تمام سرحدوں اور نسلوں کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔ اب باقی کیا رہا؟"

"خاموش! یہاں جنگ ہو رہی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ کھڑے ہو کر تماشہ دیکھ رہے ہو۔" فوجی زور سے چیختا ہے۔ "شوٹ!"

لیکن شوٹ کرنے سے پہلے ہی ایک طیارہ بم برساتا ہوا گذرتا ہے اور فوجیوں کے جسم پٹاخوں کی طرح پھٹ کر بہت دور تک بکھر جاتے ہیں۔

وہ بھاگتا ہے۔ بہت تیز بھاگتا ہے اتنا تیز کہ "شرا" کا منظر بہت پیچھے چلا جاتا ہے۔

سفر جاری رہتا ہے۔

اندھیروں اور اجالوں کے لاتعداد سلسلے بدن کو چھو کر گزر رہے ہیں اور اچانک سامنے ایک اُجلا سا مرمریں شہر ابھرتے دیکھ کر وہ چونک اٹھتا ہے۔ ایک داستانی شہر، جیسے بغداد یا استنبول۔ قدیم طرز کی عمارتیں۔ اونچے اونچے نوکیلے مینار۔ شاہراہوں پر بھیڑ۔ خوشنما دکانیں لیکن بسوں اور کاروں کا نام ونشان تک نہیں۔ ہر طرف گھوڑے گاڑیاں اور اونٹ۔ سب کے لباس ڈھیلے ڈھالے اور عجیب سے ہیں۔ سپاہیوں کی وردیوں میں سنہری جھالریں ہیں اور ان کی کمر سے تلواریں لٹک رہی ہیں۔ وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔

"وہ اونچی اونچی بلڈنگیں کہاں چلی گئیں۔ وہ عالیشان دکانیں، وہ ٹرینیں، وہ جیٹ، وہ ایرپورٹ، وہ سوئمنگ پول، وہ کالج، وہ تجربہ گاہیں اور وہ شیشے کی طرح چمکتی ہوئی سڑکیں وہ رنگین روشنیاں..... شاید اس جنگ عظیم نے دنیا کو بہت پیچھے ڈھکیل دیا ہے یا ممکن ہے لوگ جدید شہروں کی تیز اور ہنگامی زندگی سے اکتا گئے ہوں اور انھوں نے نئی تہذیب اور مشینی زندگی ترک کر دی ہو........ ان لوگوں کے چہرے کتنے پر سکون اور خوبصورت ہیں۔"

وہ آگے بڑھ کر شہر میں داخل ہوتا ہے۔

دوکانوں کی قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ محسوس کرتا ہے کہ سب اس کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ مٹی کے برتنوں کی ایک دوکان کے پاس رک کر غور سے ان برتنوں کو دیکھتا ہے۔ "ایسے برتن میں شاید کہیں دیکھ چکا ہوں۔"

قریب کھڑی ہوئی ایک لڑکی اسے گھور گھور کر دیکھتی ہے پھر بے ساختہ پوچھتی ہے۔

"تم کس دنیا سے آئے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"تمہارا چہرہ اور لباس وغیرہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب۔" وہ چونک جاتی ہے۔ "چہرے اور لباس کا شادی سے کیا تعلق۔ سچ سچ بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں اپنے عصر کو بہت پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں۔ میری رفتار بہت تیز ہے۔ میں مستقبل

کے سفر میں ہوں۔ ابھی میں بہت ...... بہت آگے جاؤں گا اور اُس عہدِ خوش خرام تک پہنچوں گا جب زرد کپڑوں میں ملبوس ایک ایسا شخص نمودار ہوگا جس کے بال گیلے نہ ہوں گے لیکن محسوس ہوگا جیسے ان سے پانی کے قطرے ٹپکنے والے ہیں اور وہ صلیب کو توڑ ڈالے گا۔ خنزیر کو ہلاک کردے گا اور تمام جنگوں کا خاتمہ کرکے سب کو مالا مال کردے گا۔"

"تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔" وہ کہتا ہے۔ "کیا تم صحیفوں کی زبان میں بات کر رہے ہو؟"

اچانک کسی طرف سے نقاروں کی تیز آوازیں اٹھتی ہیں اور بازار میں بھگدڑ مچ جاتی ہے دوکانیں دھڑادھڑ بند ہونے لگتی ہیں۔ سب بھاگتے ہیں۔ شاہراہوں پر ہاتھی اور گھوڑے دوڑنے لگتے ہیں اور دھول میں سپاہیوں کی تلواریں نمودار ہوتی ہیں۔

لڑکی کے ساتھ وہ بھی بھاگتا ہے

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ پوچھتا ہے۔

"تم نے نقاروں کی آوازیں سنی نہیں، دشمن کا لشکر حملہ کرنے والا ہے۔ شہنشاہ نے آج صبح ہی منادی کرادی تھی کہ سب جنگ کے لئے تیار رہیں۔"

"شہنشاہ" وہ حیرت سے کہتا ہے۔ "شہنشاہیت کا خاتمہ تو کب سے ہوچکا ہے۔"

"بکواس مت کرو، بھاگو کہیں پناہ لو۔"

دونوں بھاگتے ہیں۔ بھاگنے والوں کے ہجوم میں وہ لڑکی سے بچھڑ جاتا ہے اور ہجوم اسے فصیلِ شہر کے صدر دروازے کی طرف بہا کر لے جاتا ہے۔

"اندھیرا پھیل رہا ہے۔" ایک آواز ابھرتی ہے۔ "رات بھر جاگنا پڑے گا ورنہ دشمن شب خون مارے گا۔"

وہ سوچتا ہے۔ "یہاں رکنا نہیں چاہیئے۔ سپاہی مشعلیں جلائے پہرہ دے رہے ہیں۔ ممکن ہے جنگ رات میں ہی چھڑ جائے یا ممکن ہے صبح ہوتے ہی دونوں طرف سے طبلِ جنگ کی آواز ابھرے اور خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس زمانے کو جلد سے جلد عبور کرنا چاہیئے لیکن وہ لڑکی کتنی خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ کتنا چمپئی و گلابی تھا۔ اگر میری طرح تیز

رفتاری کا اعجاز اس میں بھی ہوتا تو اسے بھی شریکِ سفر کر لیتا۔ اس وقت وہ جانے کہاں ہوگی کاش میں اس کا نام ہی پوچھ لیتا۔"

وہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے شہر کو الوداعی نظروں سے دیکھتا ہے۔

اور سفر جاری ہوتا ہے۔

ایک تیز گردش ..... سارے منظروں کے میلے پیچھے بھاگ کر معدوم ہوتے جاتے ہیں

"میری رفتار کتنی تیز ہے۔" وہ مسکراتا ہے۔ چشم زدن میں وہ زمانہ کتنے پیچھے چلا گیا۔ ارے یہ کون سا عہد ہے۔ پتھروں کی عمارتیں' اونچے اونچے ستون۔ صاف ظاہر ہے کہ مشینی عہد کے بعد دنیا دوبارہ ماضی کی طرف جائے گی۔ از سرِ نو سفر کرے گی اور اپنی تاریخ کو دہرائے گی۔ سامنے وہ جو عمارتیں ہیں وہ نئی ہیں لیکن ان کا نشانِ قدیم یونانی و مصری کا ہے۔ وہ محل کتنا خوبصورت ہے۔ اس پر جو جھنڈا لگا ہوا ہے غالباً اس پر پھریرا بنا ہے۔"

وہ سامنے دیکھتا ہے۔

محل سے قریب میدان میں ہتھیاروں سے لیس سپاہیوں کے دستے' اور میدان کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ اور سب کے چہروں پر خوف و ہراس ...... سپاہیوں کے دستوں کے درمیان قیدیوں یا غلاموں کی قطاریں جن کے پیروں میں زنجیریں ہیں۔ بہت سے غلاموں کے پیروں سے خون رِس رہا ہے

وہ سوچتا ہے۔ "ممکن ہے انھیں سزا دی جائے۔ یہاں سے جلد رخصت ہونا چاہیے اذیت ناک منظر دیکھنے کی اب ذرا بھی تاب نہیں۔"

وہ اور آگے چلتا ہے۔ اندھیروں اور اجالوں کے درمیان ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ہے وہ سرشار ہو کر سامنے دیکھتا ہے۔ دور بہت دور ایک وسیع سمندر جس کا پانی سُرخی مائل ہے۔ ایک طرف پہاڑوں کے سلسلے' بیابان اور سامنے ایک وسیع و عریض دریا جس کی موجیں چمک چمک کر شور کر رہی ہیں۔ ایک سمت کچا راستہ ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس راستے پر بہت دور گرد و غبار اٹھ رہا ہے اور کچھ

ہوئے متحرک ہیں اور ان ہیولوں کے پیچھے اسی راستے پر گرد و غبار کا ایک اور زبردست طوفان اٹھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہیولے قریب آتے جاتے ہیں۔

"کوئی قافلہ ہے۔ لیکن یہ قافلہ دریا کی سمت کیوں آرہا ہے۔ کیا یہ گھوڑے اتنا وسیع، عریض اور عمیق دریا پار کر لیں گے۔ نہیں نا ممکن ہے۔ اس قافلے کی رفتار کتنی تیز ہے اور پیچھے جو طوفان ہے......" وہ چونک اٹھتا ہے۔ گرد و غبار کے اٹھتے ہوئے طوفان میں سمندر کی طرح پھیلا ہوا ایک عظیم لشکر ہے جو یقیناً اس قافلے کا تعاقب کر رہا ہے۔

"اس قافلے کے تعاقب میں اتنا بڑا لشکر؟" وہ حیرت سے دیکھتا ہے۔

پیچھے سے آتے ہوئے لشکر میں بے پناہ جوش و خروش پیدا ہوتا ہے اور برہنہ تلواریں بلند ہو جاتی ہیں۔ لشکر اور گھبرائے ہوئے قافلے کے درمیان فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔

"یہ قافلہ یقیناً ایک ہولناک مصیبت میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف پرجوش دریا اور دوسری طرف خونخوار دشمنوں کا لشکر جس میں زرہ بکتر پہنے ہوئے سپاہیوں کے جلوس میں ایک شخص شاہانہ مصری لباس میں ہے اس کے سر پر تاج ہے۔

وہ سوچتا ہے۔" بس ابھی کچھ دیر بعد یہاں پورا قافلہ کٹ جائے گا۔"

گھبرایا ہوا قافلہ دریا کے کنارے رک جاتا ہے۔

قافلے کا ایک دراز قد شخص جس کے ہاتھ میں تلوار کی بجائے ایک سونٹا ہے۔ وہ سونٹے کو پانی پر مارتا ہے۔ پانی بہت اوپر تک اڑتا ہے...... اٹھتا ہے۔ دریا میں ایک بھونچال سا آجاتا ہے اور قافلے کے سامنے پانی کے دو رویہ پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک طویل راستہ نمودار ہوتا ہے۔

وہ حیرت سے دیکھتا ہے۔ پانی کے ایستادہ پہاڑوں کے درمیان سے قافلہ نہایت تیزی کے ساتھ گذرنے لگتا ہے اور بہت آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

پیچھے سے آتے ہوئے لشکر میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شاہانہ لباس پہنا ہوا شخص سب کو آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور اپنے گھوڑے کو پانی کے درمیان بچھے ہوئے راستے پر تیزی سے

دوڑتا ہے۔ پورا لشکر اس کے پیچھے دوڑتا ہے ......

وہ سوچتا ہے۔ "قافلہ یقیناً اُس پار پہونچ گیا ہوگا"

اچانک پانی کے کھڑے ہوئے پہاڑوں میں حرکت ہوتی ہے اور وہ ڈھل کر ایک پُر شور آواز کے ساتھ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔

پورا لشکر زیرِ دریا ——— اور دریا شانت۔

اسے یاد آتا ہے کہ ماضی میں ایسا ایک معرکہ ہو چکا ہے۔ وہ حیرت سے اپنی آنکھیں ملتا ہے کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن فضا میں گرد و غبار کا طوفان ابھی باقی ہے جو اس بات کا گواہ ہے کہ اس نے خواب نہیں دیکھا۔

"لگتا ہے میں ایک بہت ہی پُراسرار دور میں آگیا ہوں۔ ایسا دور جہاں مظلوموں کو بچانے کے لئے پانی راستہ چھوڑ کر بااَدب کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے ادوار میں ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اب مجھے اور آگے چلنا چاہیئے۔ یقین ہے آگے بہت خوشگوار اور زریں دور ہوگا"

وہ بجلی کی طرح آگے لپکتا ہے۔ آگے منظر کچھ اس طرح ہے۔

ایک بڑا سا میدان ہے جہاں دو عظیم الشان لشکر ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ سپاہیوں کے جنگی لباس اور حُلیے عجیب سے ہیں۔ سر پر لمبے لمبے بال۔ پشت پر ترکش میں تیر۔ کاندھے پر کمان۔ ہاتھ میں ڈھال تلواریں اور گرز۔ گھوڑے جُتے ہوئے رتھوں کی لمبی قطاریں اور رتھوں پر بھالے اور کلہاڑی نما ہتھیار......

وہ سوچتا ہے "تو کیا جنگ آخر تک جاری رہے گی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آنے والے ادوار جنگ اور مظالم خرابے سے پاک رہیں گے۔ یہاں تو میں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتا۔ کتنے بھیانک ہتھیار ہیں یہ۔ لیکن یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے؟"

وہ آگے بڑھ کر کاندھے پر ایک بھاری گرز اٹھائے ہوئے سپاہی سے پوچھتا ہے۔

"تم سپاہی ہو یا پہلوان؟"

سپاہی اسے اور اس کے لباس کو حیرت سے دیکھتا ہے۔

"یہ جنگ کس وجہ سے ہے؟"

اس کی بات سپاہی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بھی کسی زبان میں کچھ کہتا ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سپاہی اپنی کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار اس کے سپرد کر کے اشارہ کرتا ہے کہ اس جنگ میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔

"اتنی وزن دار تلوار......" تلوار اٹھا کر اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ وہ تلوار پھینک کر بھاگتا ہے۔ بہت زور بھاگتا ہے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔

آگے سفر میں ایک ایسا علاقہ آتا ہے جہاں کے لوگوں کا قد کافی دراز ہے مگر سب کے سب اندھے ہیں۔ ہر طرف ایک انتشار اور بدحواسی ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ "یہ لوگ اندھے کیوں ہیں۔ ان کی آنکھوں کا نور کہاں چلا گیا۔ بڑا عجیب دور ہے یہ۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طلسمی دنیا کا سفر کر رہا ہوں۔ دنیا بہت تیزی سے بربادی کی طرف جا رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جوں جوں عہد بدلتے جائیں گے دنیا بدصورت ہوتی جائے گی۔ میں ہر دور میں جنگ اور تباہی دیکھتا آ رہا ہوں یہاں تک پہونچنے کے بعد دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کی آبادی کتنی کم ہو گئی ہے اور لوگ وحشیوں کی طرح رہنے لگے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اندھے کیوں ہیں۔ مجھے ان سے پوچھنا چاہیئے کہ ان کے ساتھ یہ المیہ کیوں؟"

اچانک زمین میں ایک گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے' پھر فلک شگاف دھماکے ہوتے ہیں۔ زمین جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے اور پورے علاقہ پر آگ اور پتھروں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ جیسے لاتعداد کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑے ہوں۔ پورا علاقہ آگ اور پتھروں کی بارش میں دب جاتا ہے۔ سارے اندھے دھنستی ہوئی زمین میں دفن ہو جاتے ہیں اور زمین کی تہیں الٹ پلٹ ہونے لگتی ہیں۔

وہ گھبرا کر بھاگتا ہے۔ "اف۔ کتنی بھیانک بارش ـــــ پانی کی بجائے آگ اور پتھروں کی بارش......"

بہت آگے پہونچ کر وہ سوچتا ہے۔ "اگر میں اتنا تیز رفتار نہ ہوتا تو یقیناً اسی دور میں دفن ہو جاتا۔ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ میں مستقبل کے تمام زینے پھلانگتا ہوا اس عہد تک ضرور

پہونچوں گا جس کے بارے میں سنا ہے کہ ایک ایسے شخص کا ظہور ہوگا جو تمام جنگوں اور ظالموں کا خاتمہ کردیگا اور ساری دنیا پھولوں سے ڈھک جائے گی۔ اس جزیرے تک میرا سفر جاری رہیگا۔

اس کی رفتار اور تیز ہوجاتی ہے۔ کافی دور تک چلنے کے بعد جب وہ رکتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک سرزمین کے گرد کئی سمندر ہیں اور اس کے سینے پر کئی بڑے دریا اور کوہستانی سلسلے ہیں۔ وہ اور آگے چلتا ہے۔ اسی سرزمین کے دشت وجبل سے گذرتے ہوئے اسے لگتا ہے کہ ہوا کی کیفیت اچانک بدل گئی ہے اور ہر طرف ایک سکتہ سا طاری ہوگیا ہے۔ اوپر کالے کالے مہیب بادل زمین کی طرف پیش قدمی کررہے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا پھیل رہا ہے۔ ہوا تیز چلنے لگی ہے...... ہوا اور تیز چلنے لگتی ہے۔ یکایک بادل زور زور سے چنگھاڑ کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ بھاگ کر قریب کے ایک پہاڑ پر پناہ لیتا ہے اور وہاں سے دیکھتا ہے کہ قیامت خیز بارش نے جگہ جگہ سے زمین پھاڑ دی ہے اور پھٹی ہوئی زمین میں سے پانی کے چشمے ابل پڑے ہیں۔ ایک سمت ایک بڑا سا دہانہ ہے جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں سے کوئی بپھرا ہوا سمندر ابل رہا ہے جو تمام درختوں اور گھروں کو اکھاڑ کر گھاس پھوس کی طرح بہاتا ہوا چاروں طرف پھیل رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پورا علاقہ زیرآب ہوجاتا ہے۔

وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہے۔ بارش ہورہی ہے۔ تمام قصبے، شہر اور کوہستانی سلسلے ڈوب چکے ہیں۔ پانی میں زبردست ہیجان ہے۔ طوفان مسلسل گردش کررہا ہے۔ اور اندھیرا اور گہرا ہوتا جارہا ہے۔ اتنا گہرا کہ اب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ "نہیں معلوم کتنے دن گذر گئے"۔

ایک بار بجلی بہت زور سے چمکتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ کوئی کالی شے طوفان کے تھپیڑے کھاتی ہوئی پہاڑ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ "ممکن ہے کوئی کشتی ہو۔ چاروں طرف پانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے اس دور سے آگے جانا چاہیئے۔ یہاں تو سب کچھ زیرآب اور تندیٔ طوفان ہوچکا ہے۔ اے سرزمین آب...... تجھے سلام۔ میں اپنے آپ کو اس طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے آگے جارہا ہوں"۔

وہ آگے بڑھ کر بہت سارے اندھیروں اور اجالوں کو عبور کرتا ہے۔ سفر میں بہت سارے خوبصورت مناظر اس کا دامن کھینچتے ہیں، اسے بلاتے ہیں۔

"آؤ کچھ لمحے ہمارے ساتھ گذارو۔ دیکھو ہمارے پاس کتنا حسن اور تازگی ہے۔"

لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ طوفان اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ بغیر کہیں قیام کئے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ کئی ادوار سے گذرنے کے بعد ایک نہایت خوبصورت منظر دیکھ کر وہ رک جاتا ہے۔ ہر طرف سرسبز و شاداب جنگل، پہاڑ، آبشاریں اور ندیاں، پرندوں کی چہچہاہٹ اور دور دور تک کسی بھی قصبے کا نام و نشان تک نہیں۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ شہد کے چھتے لٹک رہے ہیں۔ جنگلی پھولوں کے پودے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ندیوں کے کنارے ہری ہری گھاس پھیلی ہوئی ہے۔

"سب لوگ کہاں گئے؟" وہ سوچتا ہے۔ "ممکن ہے درختوں کے اس پار پہاڑوں کے دامن میں کوئی قصبہ ہو۔"

وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گذرتا ہوا پہاڑوں کے دامن تک پہونچتا ہے۔ دامن میں ایک نیلی جھیل ہے۔ وہ ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ جھیل کے ایک گوشے میں ایک اونچی چٹان کے قریب کچھ جوان لڑکیاں نہا رہی ہیں۔ ان کے بدن سونے کی طرح چمک رہے ہیں۔ وہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے۔

"وہ لڑکی اسوقت کہاں ہوگی جس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ تم کس دنیا سے آئے ہو۔ اس کا رنگ کتنا چمپئی و گلابی تھا۔"

کچھ دیر بعد لڑکیاں نہا کر باہر نکلتی ہیں تو جانوروں کی کھال سے اپنے جسم ڈھانکنے لگتی ہیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر ان کے قریب جاتا ہے۔ لڑکیاں اسے اور اس کے لباس کو دیکھ کر سہم جاتی ہیں اور شور کرتی ہیں۔

اچانک پہاڑوں کی گپھاؤں سے بہت سارے مرد نکل کر بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے عورتیں بھی ہیں اور سب کے ہاتھوں میں پتھر اور ہڈیوں کے ہتھیار ہیں۔

"شاید یہ قبائلی ہیں۔" وہ سوچتا ہے۔ "کتنے وحشی لگ رہے ہیں۔"

وہ سب قریب آکر اسے اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں اور گلے سے عجیب عجیب طرح کی آوازیں نکالتے ہیں۔ وہ سہم جاتا ہے۔ پھر حواس مجتمع کر کے کہتا ہے

"تم لوگ انسان ہو یا جانور۔ ایسی آوازیں تو ہمارے یہاں گھوڑے، گدھے اور ہاتھی نکالتے ہیں؟"

اس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ سب چیخنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ تمام قوت لگا کر زور سے کہتا ہے۔

"سنو! میں پچھلے زمانوں کی طرف سے اور بہت دور سے آیا ہوں۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ مستقبل میں انسان دوبارہ جانور اور وحشی بن جائے گا۔ میں ایک مہذب انسان ہوں میرے ساتھ تہذیب سے پیش آؤ۔ میرے کپڑے مت نوچو۔ ان لڑکیوں سے کہو اپنے سینے ڈھانک لیں اور تم لوگ بھی ٹھیک طرح سے اپنے بدن ڈھانکنے کی کوشش کرو۔ میں اس عہد تک پہنچنے کا فیصلہ کر چکا ہوں جب زرد کپڑوں میں ملبوس ایک ایسے شخص کا ظہور ہوگا......" وہ بہت کچھ کہتا ہے مگر احساس ہوتا ہے کہ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

وہ اسے کھینچ کر ایک گپھا میں لے جاتے ہیں اور اسے اندر دھکیل کر ایک بڑے پتھر سے گپھا کا دہانہ بند کر دیتے ہیں۔

"اُف۔ یہ میں کس دور میں آ پھنسا؟" وہ گھبرا کر چاروں طرف گھومتا ہے مگر باہر نکلنے کا راستہ کہیں نہیں ملتا۔ کافی وقت گذر جاتا ہے۔ شاید رات آجاتی ہے۔ دہانے کا پتھر سرکتا ہے۔ دو چار مرد اندر آتے ہیں اور اسے پکڑ کر باہر نکالتے ہیں۔ باہر رات ہے اور پورا چاند روشن ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جھیل کے کنارے پھیلی ہوئی زمین پر سینکڑوں مرد اور عورتیں ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں دو زانو بیٹھے ہیں اور منہ سے عجیب عجیب طرح کی آوازیں نکال کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہیں اور چاند کو سجدہ کرتے ہیں۔

ایک بوڑھا مرد اسے اشارہ کرتا ہے کہ وہ بھی چاند کی عبادت کرے۔

"چاند کی پرستش؟" وہ چونک اٹھتا ہے۔ پوری وادی اسے گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چاند کی پرستش تو انسان پتھروں کے عہد میں کرتا تھا اور ان لوگوں کے پاس پتھروں اور ہڈیوں کے ہتھیار ہیں۔ یہ گپھاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کی کوئی زبان نہیں۔ یہ جانوروں کی کھال سے جسم

ٹھٹکتے ہیں ۔

تو کیا میرا سفر مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف رہا ہے ؟

میں اپنے عہد سے کتنے پیچھے آگیا ہوں ۔ مجھے فوراً واپس ہونا چاہیئے میں اپنے عہد سے کٹ کر جی نہیں سکتا ۔ میں ضرور واپس جاؤں گا ۔ ان تمام جنگلوں اور طوفانوں کو دوبارہ پار کروں گا ۔"

وہ بھاگتا ہے ۔

بہت تیز بھاگتا ہے ۔

مگر محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے ساتھ پورا جنگل ، تمام پہاڑیاں ، ندیاں اور گپھائیں بھاگ رہی ہیں ۔

اور وہ خود ان سب کے درمیان گردش کر رہا ہے ۔

بائیں پسلی

رات، تنہائی، سناٹا...... بابا...... اور ہر طرف مس افروز کی آنکھیں۔
یہ آنکھیں مجھے قید رکھنا چاہتی ہیں۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔ (سالی کہیں کی) یہ سڑک، یہ بجلی کے کھمبے، یہ روشن نیم روشن دریچے، یہ سب سالے کمینے کے ہیں۔ مس افروز مجھے پاگل سمجھتی ہے۔ اس کی کوٹھی میں تو سب ہی مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ (لیکن بھی اس کوٹھی میں کسی نے کیسے نہیں کاٹا؟) افروز کی ناک پر میرے دانتوں کے نشان آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ یہ سڑک کتنی اداس اور تھکی تھکی سی ہے۔ جیسے کوئی ابھاگن...... کملاوتی بھی ابھاگن ہے۔ بے چاری...... اس کی ناک کتنی چھوٹی سی ہے۔ دیکھو تو ہنسی آتی ہے۔ یہ درخت شاید پیپل کا ہے۔ اس کے پتے کتنے چمکدار ہیں، جیسے دبیز شیشوں کی عینک لگائے ہوں۔ عینک لگانے سے شخصیت کتنی پرکشش ہو جاتی ہے۔ اگر شہر سے تمام عینکیں سمیٹ لی جائیں تو پھر شہر میں دیکھنے کو رہ ہی کیا جائے گا۔ اس شہر میں ایک بہت ہی مزیدار آدمی ہے۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔ کم بخت یاد ہی نہیں رہا...... وہ خود کو شاعر اعظم سمجھتا ہے۔ اس کی شیروانی پتہ نہیں کیوں، مجھے بھینس دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بھینس بھی کیا غضب کا جانور ہے۔ میں نے بچپن میں پڑھا تھا اس کے دو سینگ اور ایک دم ہوتی ہے۔ لیکن دو سینگ اور ایک دم تو گائے کو بھی ہوتی ہے۔ بس سالا سینگوں کا فرق ہو جاتا ہے۔ دونوں میں کتنا کم فرق ہوتا ہے۔ اُف اُف۔ آرٹسٹوں کو بھینس بنانے میں کتنی دشواری ہوتی ہوگی۔

مس افروز اس وقت شراب کے نشے میں دھت اپنی خوابگاہ میں ہوگی۔

اس کی خوابگاہ میں کتنی حیرت انگیز تصویریں ہیں۔ پنجرے میں سورج۔ رنگوں کے بھٹے دائرے۔ بکری کے سر والی لڑکی۔ بے سر کا گھوڑا اور ایک بے ناک کی ننگی عورت۔ چھی چھی... .... دنیا کتنی تیزی سے عریانیت کی طرف بھاگ رہی ہے۔ افروز نے مجھے اپنے جال میں پھنسانے کی بہت کوشش کی۔ وہ شاید مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ (شادی تو مجھ سے سبھی لڑکیاں کرنا چاہتی ہیں) اسے میرا چہرہ بہت پسند ہے (میرا چہرہ تو شہر کی سبھی لڑکیوں کو بہت پسند ہے۔) وہ اکثر کہا کرتی ہے۔

"تمہیں دیکھ کر کوئی بھی لڑکی تمہاری طرف کھنچ سکتی ہے۔"

"اور یہ سچ ہے۔ روبینہ۔ شکیلہ۔ جمیلہ۔ عقیلہ۔ شبانہ۔ پروین۔ زلیخا۔ ساجدہ نیلوفر۔ شہناز۔ فریدہ۔ نرگس۔ فوزیہ۔ نسرین وغیرہ وغیرہ سب میرے چہرے پر مرتی ہیں۔

تو کیا لڑکیاں صرف چہروں پر ہی مرتی ہیں ـــــ ؟

یہ بجلی کا کھمبا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کاش کسی لڑکی کو اس سے محبت ہو جائے۔

افروز سے میری ملاقات عجیب حالت میں ہوئی تھی۔ ایک سال پہلے کی بات ہے........

اُف آج آسمان کتنا صاف ہے۔ شکیلہ کی بلّی کے بال بھی ایسے ہی صاف ستھرے ہیں۔ سفید سفید نرم و ملائم۔ اسی لئے تو وہ اتنی مغرور ہے۔ مجھے شکیلہ کی ناک بہت پسند ہے (عورتوں کے چہروں میں بس ایک ہی چیز تو دیکھنے جیسی ہوتی ہے: ناک) اس کی بلّی پتہ نہیں کیوں مجھے گھورتی بہت ہے۔ شاید ڈرتی ہے کہ کہیں میں اسے کاٹ نہ لوں۔ دھت! میں آدھا بدھو تھوڑی ہوں۔ پگلی کہیں کی۔

ہوا کتنی آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ جیسے بیمار ہو بے چاری۔ روبینہ بھی کچھ دنوں سے بیمار ہے۔ اسے خواب میں چلنے کی عادت ہے۔ ایک بار خواب میں وہ میری مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئی تھی۔ مرغیاں سمجھیں کہ بلّی آگئی' اب ہوئی آفت۔ انھوں نے اتنا شور مچایا اتنا شور مچایا کہ کئی بلیاں سچ مچ چلی آئیں........

یہ لال بنگلہ ریحانہ کا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس میں بھوت رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ بنگلہ خوفناک

بھوت لگتا ہے سالا۔ (پتہ نہیں بھوت کیسے ہوتے ہوں گے، میں نے آج تک نہیں دیکھے، ممکن ہے نیلوفر کے ڈیڈی کی طرح ہوتے ہوں۔ وہ پتہ نہیں کیوں مجھ سے بہت خائف رہتے ہیں۔ حالانکہ میں بھی اُن سے بہت خائف ہوں۔ مجھے ان کی مونچھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مس افروزا اس وقت شراب میں مکمل طور پر ڈوب چکی ہوگی۔ اس عالم میں اسے اپنے لباس کی ذرا بھی پروا نہیں رہتی۔ ایک بار میں نے اسے پھر اس حالت میں دیکھا کہ بدن میں تارے دوڑنے لگے۔ اُف اس کا بدن کتنا گورا گورا ہے اور کتنا چکنا چکنا...... نرگس کا بدن بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن مجھے صرف اس کے کان ہی پسند ہیں۔ اس کے کانوں کی لوئیں کتنی سُرخ ہیں، جیسے لال مرچ۔ لال مرچ کتنی تیز ہوتی ہے...... سی سی۔ نرگس سے میری پہلی ملاقات فوزیہ کے گھر ہوئی تھی۔ فوزیہ بڑی فضول لڑکی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہے۔ ابھی آخری بار جب میں اس سے ملنے گیا تھا تو وہ اپنی نوکرانی کی چمپی کر رہی تھی۔ اس کی ناک؟ اس کی ناک مجھے بالکل پسند نہیں۔ لیکن چلے گی۔ سُنا ہے ساجدہ امید سے ہے۔ اُمید پر تو ساری دنیا قائم ہے۔ (اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساری دنیا حاملہ ہے) نیلو (فر) کے ڈیڈی بھی عجیب آدمی ہیں۔ جب سے انھوں نے مونچھیں بڑھائی ہیں۔ بغیر چشمے کے گھر کے باہر نہیں نکلتے۔ بھلا چشمے کا مونچھوں سے کیا تعلق؟ اس کا تعلق تو براہ راست ناک سے ہے۔ اور ناک کے ہوتے ہوئے مونچھیں دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ نیلو کتنی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ دبلی پتلی سی۔ بالکل ککڑی کی طرح لیکن ککڑی بھولی بھالی کب ہوتی ہے (سوری) بھولی بھالی تو مرغیاں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ بے چاری کُٹ کُٹ ہی کیا کرتی ہیں کائیں کائیں کبھی نہیں کرتیں۔ شاید یکسانیت کا شکار ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اپنی آواز میں تھوڑی سی تبدیلی لائیں۔ یہ نیا عہد ہے۔ اس عہد میں مختلف قسم کی آوازیں نکالنا بہت ضروری ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھو۔ میں تو ہر طرح کی آوازیں نکال سکتا ہوں۔ ککڑوں کوں (صبح ہو گئی) ٹیں ٹیں (تجا جی بولی کائیں کائیں (مہمان آئے) پیم پوم (بازو ہٹو!) میاؤں میاؤں (آل چھیں۔ آل چھیں!) سوری۔ اس وقت سب سو رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ نیند نہیں آتی ہے۔ افروز سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اس نے میری نرمی ہڑپ کر لی۔ وہ ایک طرف تو مجھے پاگل کہتی ہے اور دوسری طرف کہتی ہے "تم جانے کس دیس کے شہزادے ہو"

پروین بھی اکثر یہی کہتی ہے۔ لیکن پروین بڑی خطرناک لڑکی ہے۔ اس سے بچ کے رہنا چاہیئے۔ کہتی ہے

"کسی روز تمہیں بھگا لے جاؤں گی۔"

بڑی مصیبت ہے بابا۔ میں بھی کہاں آن پھنسا ہوں۔ شبانہ بڑی شکی مزاج لڑکی ہے۔ سائیکولوجی نے تو اس دماغ ہی خراب کر رکھا ہے۔ کل شام جب میں مونگ پھلی کھا رہا تھا تو اس نے جانے کیسے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میں اس سے بیزار ہو گیا ہوں۔ دراصل اسے اپنی اونچی ناک پر بڑا غرور ہے۔ کسی دن کاٹ بیٹھوں گا ہاں!

وہ آدمی پتہ نہیں کون تھا جو سبز لباس میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ شاید اس پر بہار آئی ہوئی تھی۔ ساری بکریاں اس کے لباس کو کتنی حسرت سے تک رہی تھیں۔ پھر بکریاں تو منہ میں پانی بھرے اس کے پیچھے تھیں۔ یہ سفید کوٹھی ابھی تک روشن ہے۔ اس میں رہنے والے کتنے پری چہرہ ہیں۔ مجھے دیکھ کر جانے کیوں دروازے بند کر لیتے ہیں۔ شاید شرماتے ہیں۔ یہ کچرے کا ڈرم اوندھا کیوں پڑا ہے۔ ارے! اس میں تو کتے کے پلے سو رہے ہیں۔ واہ کیا پیارے پیارے پلے ہیں۔ لیکن یہ سب الّو کے پٹھے ہیں۔ بتاؤ! اگر کسی نے ڈرم سیدھا کر دیا تو کیا یہ اس میں سے نکل سکیں گے؟ سمجھ میں نہیں آتا آج کل دنیا کی عقل کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔

یہ لال لال بتی کیسی؟

اچھا، ٹریفک بند ہو رہا ہے۔

چلو بھئی اب یہاں سے مڑ جاتے ہیں سالے کو۔

اوہو۔ یہ راستہ تو بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ دونوں طرف قمقموں کی قطار ہے جیسے کوئی جشن رہا ہو۔ سعیدہ کے دانت کتنے خوبصورت ہیں۔ سفید سفید۔ اور اس کے گال؟ (ہائے) بالکل گولڈ اسپاٹ کی طرح بھرے بھرے کھٹے میٹھے۔ اور آنکھیں؟ شربتِ روح افزاء۔ اور ہونٹ؟ مینگو جوس۔ مشروبات کا صحیح لطف تو ان محبوباؤں میں ہے۔ لیکن یہ محبوبائیں کہاں۔ یہ سب تو جان کی دشمن ہیں۔ کھا جائیں گی۔ چبا جائیں گی۔

افروز سے میری ملاقات عجیب حالت میں ہوئی تھی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ مجھ سے قریب ہی رہتی ہے

ایک سال پہلے کی بات ہے۔ ایک سال پہلے شہر میں ایک سرکس آیا تھا۔ شیر، چیتے، بھالو، بندر ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ اس وقت مجھے مرغی پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرغی جو بہت دنوں سے کُڑک تھی، ایک دن جانے کیسے افروز کے باورچی خانے میں گھس گئی۔ (بدتمیز کہیں کی) میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ افروز اس وقت نشے میں تھی۔ نشہ میں لڑکیوں کے چہرے کتنے مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ زلیخا بھی اکثر نشے میں رہتی ہے۔ اس حالت میں اس کا چہرہ کتنا لمبوترا ہو جاتا ہے۔ ہی ہی..... ہا ہی۔ میں نے افروز سے سختی کے ساتھ اپنی مرغی طلب کی۔ اس نے لاعلمی ظاہر کی اور ڈانٹ بھی دیا۔

"میں نہیں جانتی تمہاری مرغی ورغی۔ گٹ آؤٹ!"

(چوٹی کہیں کی) میں نے کہا

"سیدھے سے نکالو میری مرغی۔ نہیں تو ہاں......"

وہ پئے ہوئے تو تھی ہی۔ بگڑ گئی۔ پہلے تو مجھے گالیاں دیں، پھر چانٹا مارا۔ اور پھر بکوٹ بھی لیا۔ اُف۔ کتنی زور سے بکوٹا تھا اس نے مجھے۔ میرے تو آنسو نکل آئے۔ پھر غصہ بھی آیا اور میں نے بھی اس کی وہ پٹائی کی، تاکہ محترمہ کا سارا نشہ ہی اتر گیا۔ اور کپڑے؟ ہی ہا......ہی ہی۔

"اب لاؤ میری مرغی" میں نے گھونسہ دکھایا "نہیں تو ہاں!....."

وہ خاموش رہی ——— میں نے پھر کہا۔

"میری مرغی ابھی، اور اسی وقت حاضر کرو۔ ورنہ پٹو گی بہت۔"

وہ ہنسنے لگی ——— "چلو پٹو..... اور پیٹو، خوب پیٹو۔"

میں حیرت میں پڑ گیا۔ واقعی لوگ سچ کہتے ہیں۔ عورت کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ خدا نے کیا چیز چھوڑ رکھی ہے دنیا میں۔ لیکن نسرین کی ناک اتنی بھدی کیوں ہے؟ جیسے بینگن....... لیکن بینگن بھدا کہاں ہوتا ہے۔ بے چارے کو رشک میں خواہ مخواہ بدنام کر دیا گیا۔ واہ ری دنیا! جیسے شہنشاہ تربوز کو ابھی تک کسی نے دیکھا ہی نہیں...... افروز کی باورچن تو ادھیڑ ہونے کے باوجود خوبصورت لگتی ہے۔ اسے شاید اپنے باورچن ہونے پر بڑا ناز ہے۔ وہ اکثر مجھے متوجہ کرنے کے لئے سیٹی بجاتی ہے۔ چند روز پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"تم مجھے بھگا کیوں نہیں لے جاتے جی"

رضیہ آج کل ایک گہرے رنگ کی کار میں بہت گھوم رہی ہے۔ وہ کار کس کی ہے؟ وہ کسی
زمانے میں مجھے آلو کی روٹیاں کھلایا کرتی تھی۔ آلو کی روٹیاں ایسی لگتی ہیں جیسے بینگن کی کھیر....
وحت! رضیہ کا چہرہ اکثر مجھے پراٹھا دکھائی دیتا ہے۔ افروز اگر عیاش نہ ہوتی تو اچھی لڑکی ہوتی۔
اس نے ایک بار مجھے شراب پلا دی تھی۔ وہ سمجھی کہ اس طرح میں اس کی طرف کھنچ جاؤں گا۔ لیکن مجھے
تو رونا آگیا۔ وہ رات میں نے بڑی مشکل سے کاٹی۔ لال' پیلے اور کالے دھبے رات بھر میرا تعاقب
کرتے رہے۔ لال سمندر...... کالا سمندر....... پیلا سمندر...... اور اس میں تیرتے
ہوئے سینڈل' برہنہ پیر' اسکارف اور اوپر پہیلی کوپٹر کی آواز...... اب شراب کبھی نہیں پیونگا۔
رشیدہ کو رنگین کپڑے پہننے کا کتنا شوق ہے۔ سراپا چمن بردوش! پچھلے دنوں ملی تھی تو اس کے
بال کٹے ہوئے تھے۔ جیسے دُم کٹی گلہری۔ اب ملے گی تو پوچھوں گا۔

"کیوں بھئی ـــــــ ناک کٹوانے کا کب ارادہ ہے؟"

یہ لڑکیاں بھی کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ ناک کٹوانے کی بجائے بال ہی کٹوا لیتی ہیں اور
سمجھتی ہیں اب انھیں کوئی بے وقوف نہیں سمجھے گا۔ ہاں ایک بات یاد آگئی۔ افروز کی ناک پر
بھی میرے دانتوں کے نشان ہیں۔ اس روز اس نے میرا بوسہ لینے کی کوشش کی تھی میں نے اسکی
ناک کاٹ لی...... ہا ہا... اب وہ ایسی حرکت ہرگز نہیں گی۔ یہ سڑک کچھ جانی پہچانی سی
لگ رہی ہے۔ جیسے مہاجن کی بدمزاج بھینس جو دن بھر کھونٹے کے گرد گھوم گھوم کر رسّی چھوٹی
اور بڑی کرتی رہتی ہے۔ افروز نے کتنے ہی ڈاکٹروں سے میرا علاج کرانے کی کوشش کی (بدھو!
مجھے ہوا ہی کیا ہے؟) ڈاکٹروں سے مجھے بے حد چڑ ہے۔ ان کے چہروں سے کتنی حماقت برستی
ہے۔ دیکھو تو فوراً سمجھ میں آجاتا ہے کہ کسی اچھے پاگل خانے سے سند لے کر آئے ہیں۔
میں نے بھی ان کا استقبال بڑی خود اعتمادی سے کیا۔ ایک ڈاکٹر کا چشمہ توڑ دیا۔ دوسرے کی
مونچھیں نوچ لیں۔ تیسرے کا اسٹیتھسکوپ غائب کر دیا۔ اور چوتھا ڈاکٹر سمجھدار تھا۔ وہ خود غائب
ہوگیا..... ہا ہا.... معتبر ذرائع سے مجھے آئے دن معلوم ہوتا رہتا ہے کہ کچھ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔
یہ سراسر یک طرفہ فیصلہ ہے۔ میں تو کسی کو پاگل نہیں سمجھتا۔ وہ پروفیسر میری طرف کتنی حیرت سے دیکھ

رہا تھا جیسے میرے چہرے پر دو ناکیں ہوں۔ لیکن اس پروفیسر کے کان کتنے بڑے بڑے تھے۔ پتہ نہیں کس طرح کچھ پروفیسروں کے کان اتنے بڑے ہو جاتے ہیں۔ افروز جب ہنستی ہے تو اس کے گال کتنے گلابی ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت مجھے اپنی مرغیوں کی بہت یاد آتی ہے۔ نیلو کے ڈیڈی کئی دنوں سے مادام ماریا کی کوٹھی کے آس پاس بہت نظر آ رہے ہیں۔ آج صبح وہ اس کے گیٹ کے پاس تنہا کھڑے کیلے کھا رہے تھے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کسی عورت کو پھانسنے کا؟ بکری پھنس جائے یہ الگ بات ہے۔ افروز آخر میرے لئے اتنی دیوانی کیوں ہے۔ اس لڑکی نے تو مجھے بہت ہی پریشان کر رکھا ہے۔ کہتی ہے۔

'میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ تمہارا وحشی پن مجھے بہت پسند ہے۔'

گویا میں کوئی بھیڑیا ہوں۔ لیکن وہ مجھے وحشی کیوں سمجھتی ہے؟ ہوں' سمجھا! ...... ضرور اس پر ادبی کتابوں کے مطالعہ کا اثر ہے۔ یہ سڑک کس سمت جا رہی ہے؟ اور جلدی آ گیا آرہا ہے یہ بابا کا بورڈ یہ کیسے دلکش۔ ارے' یہ سڑک تو افروز کی کوٹھی کی طرف جا رہی ہے۔ نہیں نہیں مجھے اس طرف نہیں جانا ہے چلو سالے کو یہاں سے گھوم جاتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے پتوں والا بادام کا درخت کتنا گم سم ہے۔ اس کے پتے کتنے لال ہیں۔ شاید پت جھڑ آ گئی ہے۔ کبھی کبھی شبانہ کے ہونٹ بھی ایسے ہی لال رہتے ہیں۔ افروز اب شاید سو چکی ہوگی۔ سوتے وقت وہ کتنی بھلی لگتی ہے۔ کئی راتوں سے پتہ نہیں میری نیند کہاں غائب ہو گئی ہے۔ ہر لڑکیوں کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ سوتے میں اگر کوئی آ کر دم سے کود جائے تو؟ افروز سے بچنا کتنا مشکل ہو گیا ہے میں جہاں بھی جاتا ہوں وہ مجھے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس سے بہت ہی خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ٹھہرا شریف آدمی۔ بھلا اس کا کر کیا سکتا ہوں۔ اس سے کسی بھی طرح بچنا چاہیئے۔ شکیلا کی بچی کل مجھے دیکھ کر کتنا اکڑ کر چل رہی تھی جیسے میں اس سے جلتا بھنتا تو ہوں۔ اور کل وہ بیوٹیشن' شبانہ مجھے کیسی پیاسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اور نیلو؟ اور ...... رتی؟ ...... توبہ توبہ۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں ان سب سے۔

اُف آخر ان سب سے کیسے چھٹکارا پایا جائے
خودکشی؟ ——— (نہیں)

میں ایک پھیلتا ہوا دائرہ

"میں آتشِ حیات ہوں کر سانس لینے والوں کے جسموں میں سرایت
کر جاتا ہوں۔ مجھ سے بلند تر کوئی نہیں ہے اس کے باوجود سب مجھ
سے برگشتہ ہیں اور وہ فطرتیں جو تاریک ہیں وہ بھی مجھ سے ہیں
لیکن میں ان میں نہیں ہوں:" (گیتا)

اور ——— ان کے اور میرے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔
میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں۔
اور جو بھی ان لوگوں میں سے نہیں ہوتا اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔
اس بار وہ لوگ مجھے کھینچ کر سب سے بڑے چبوترے پر لے آئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے چاروں طرف سروں کا سمندر پھیل گیا ہے۔ اونچی اونچی عمارتوں، گنبدوں، میناروں اور قلعے کی فصیلوں پر لاکھوں سر شہد کی مکھیوں کی طرح چپکے ہوئے میری طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں اور اتنا شور کر رہے ہیں جیسے مجھے ان کے وجود پر شبہ ہو۔
چبوترے پر ایک بڑا اسٹیج ہے جس پر خاردار جھاڑیوں کی ٹہنیاں پھیلا دی گئی ہیں۔ درمیان میں ایک تخت رکھا ہوا ہے جو غالباً انسانی ہڈیوں کا بنا ہوا ہے۔
پیچھے سے کچھ تحکمانہ آوازیں ابھرتی ہیں: "چلو آگے بڑھو!"
اچانک پیٹھ میں کئی بھالوں کی نوکیں چبھنے لگتی ہیں۔
"معزز مہمان!" ایک بوڑھا طنزیہ کہتا ہے: "تمہاری تخت نشینی کا لمحہ اب قریب آگیا ہے۔"

میں اسے غور سے دیکھتا ہوں۔ اس کے چہرے پر مکڑیوں نے جالا تان رکھا ہے' کاش اسکے
چہرے پر چیل کوؤں نے گھونسلہ بھی بنا دیا ہوتا۔ یہ بوڑھا درخت کئی بار میرے سامنے آچکا ہے۔ میں
نظریں اٹھا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ ہر طرف لال لال زبانیں دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ زبانیں ہیں
یا جھنڈیاں ــــ؟

سب کے چہرے جذبات سے اور بھی سیاہ ہوگئے ہیں۔ آواز میں بھیڑیوں کی طرح غراہٹ
پیدا ہوگئی ہے اور آنکھیں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح زیادہ چمکنے لگی ہیں۔

شاید میرے قتل کا منظر دیکھنے کے لئے سب بہت بے چین ہیں۔

"آگے بڑھو!" بھالوں کی نوکیں اب پیٹھ میں اترنے لگی ہیں۔ میں لڑکھڑا کر اسٹیج پر چڑھتا ہوں۔
کانٹوں کی ٹہنیاں کسمساتی ہیں۔ پیروں سے خون کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔

سب میرے خون کو کتنی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

"معزز مہمان' تخت پر بیٹھ جاؤ" اب تمہیں تاج پہنایا جائے گا"

میں اس آواز کو پہچانتا ہوں۔ یہ اسی بوڑھے کی آواز ہے جو خشک درخت کی طرح بے برگ
و بار اور بے سایہ ہے۔ کاش اس کے گھونسلے میں سانپ بھی ہوتا۔

میں تخت پر بیٹھ کر ایک بار پھر سب کو دیکھتا ہوں۔ سب بہت خوش ہیں اور جانے کون سا نعرہ
لگا رہے ہیں۔ بوڑھا ہاتھ اوپر اٹھا کر کچھ اشارہ کرتا ہے۔ کچھ ننگ دھڑنگ سی کالی کالی عورتیں
تھال میں کانٹوں سے بنا ہوا ایک تاج لے کر قریب آتی ہیں۔

بوڑھا تھال سے تاج اٹھا کر میرے سر پر جما دیتا ہے۔

لہو کی ایک دھار پیشانی سے سرک کر آتی ہے اور ہونٹوں کو چومنے لگتی ہے۔

بوڑھا میرے ہاتھ میں انسانی کھوپڑی کا ایک پیالہ تھما دیتا ہے: "لو اسے پی جاؤ ـــ"

میں پیالے کو غور سے دیکھتا ہوں۔

"پی جاؤ ــــــــ پی جاؤ!!"

چاروں طرف شور اتنا تیز ہوگیا ہے کہ میرے ہونٹ خود بخود پیالے سے چپک جاتے ہیں۔
کوئی شعلہ...... کوئی بہت تیز شعلہ اندر اترنے لگا ہے...... کانچ کی کرچیاں

لہو میں دھندسے لگی ہیں..... بدن میں زلزلہ سا آگیا ہے..... کچھ بجلیاں سی ٹوٹنے لگی ہیں۔
پیالہ خالی کرکے جب میں نظریں اٹھاتا ہوں تو...... سامنے ایک سبز پردہ سا کھینچ آیا
ہے۔ سلا منظر سبز ہو گیا ہے۔
"تو کیا ان لوگوں نے مجھے زہر دیدیا؟"
میں تخت سے اٹھنا چاہتا ہوں مگر لڑکھڑا کر نیچے گر جاتا ہوں۔

میں ان سب سے چھپتا پھر رہا ہوں مگر جانتا ہوں ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھے دیکھ لے
گا۔ میرے قدموں کی آہٹ اور بدن کی باس ان سب سے مختلف ہے۔ یہ شاید میری کمزوری ہے کہ
میں اپنا چہرہ نہیں بدل سکتا۔ اس پر کوئی نقاب نہیں ڈال سکتا۔ میں جیسا اندر ہوں۔ ویسا ہی باہر
بھی ہوں۔ مستحکم، مضبوط، سخت، کھردرا اور اٹل۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظریں مجھ پر فوراً پڑ جاتی ہیں۔
میں چلتے چلتے سوچ رہا ہوں ......کیوں نہ اُن پہاڑوں پر چلا جاؤں جہاں صرف آسمان،
برف، ہوا اور شعاع ہے۔ مگر وہاں رہ کر فائدہ؟
"وہ دیکھو!"
ہجوم میں ایک شخص خوشی میں چیخ اٹھتا ہے۔ اس کی انگلی میری جانب اٹھی ہوئی ہے اور
اس کی خنجر سے مشابہ انگلی میں جیسے کوئی سرخ آنکھ کھل گئی ہے جو مجھے مسلسل گھور رہی ہے۔
اور اب ـــــ میں پھر ان کے حصار میں ہوں۔
وہ سب مجھے پہاڑ کی چوٹی کی طرف لے جا رہے ہیں ان کے ہاتھوں میں دف ہیں اور حلق
میں ہزاروں طرح کی آوازیں۔ آنکھوں میں وحشیانہ چمک ہے اور بدن میں بے انتہا جوش۔
یہ وہ پہاڑ ہے جس کی وادی میں سنگینوں کی طرح نوکدار چٹانیں کھڑی ہیں۔ میں جانتا
ہوں مجھے اوپر سے ان نوکیلی چٹانوں پر پھینک دیا جائے گا اور پھر ہزاروں گدھ بہت زور
سے شور مچا کر میرے ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔
سب لپنے اپنے حلق سے عجیب عجیب طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں، زور زور سے
دف پیٹ رہے ہیں اور میری طرف انگلی اٹھا اٹھا کر نا معلوم کیا کہہ رہے ہیں۔

ایک نوکیلے نقوش چہرے والا بوڑھا ہجوم میں سے نکل کر اپنے بانسری کی طرح سوکھے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھا کر ہجوم کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔

ہجوم خاموش ہو جاتا ہے۔

بوڑھا میری طرف متوجہ ہو کر طنزیہ انداز میں پوچھتا ہے۔

"تمہاری آخری خواہش کیا ہے سرکش گھوڑے؟"

"تم میری کوئی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تم خود ادھورے ہو۔ لیکن تم لوگ مجھے سزا کیوں دے رہے ہو؟"

"تم ہم میں سے نہیں ہو۔ تم مجرم ہو۔"

"میرا جرم؟"

"تمہارا جرم یہی ہے کہ تمہاری وجہ سے یہاں سارا امتیاز ہے۔ تمہاری ہر بات ہم سے نرالی ہے۔ تمہارا قد اس عہد کے برخلاف ہم سب سے اونچا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہماری پوری نسل احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ ہم تمہیں زندہ نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ ہمیں زندہ رہنا ہے۔ ہاں تمہیں صرف اس شرط پر معاف کیا جا سکتا ہے کہ تم بھی ہماری طرح بن جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے۔ اپنے آپ کو بدلنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔ میں اداکاری نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ دیکھو نیچے نوکدار چٹانیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

بوڑھا قریب سے ہٹ جاتا ہے۔

کچھ ہاتھ آگے بڑھ کر مجھے اوپر اٹھا لیتے ہیں۔

میں الوداعی نظروں سے گرد و پیش کے منظروں کو دیکھتا ہوں۔ نیچے سنگینوں کی طرح نوکدار چٹانیں مجھے منتشر کرنے کی منتظر ہیں۔

اور اب..... میں کٹی ہوئی شاخ کی طرح نیچے گر رہا ہوں۔

وہ دیکھو ـــــــ!

دوسری طرف جاتا ہوا سارا ہجوم میری طرف گھوم گیا ہے۔

اور اب میں پیراں کی قید میں ہوں۔ میرے سامنے تیر کمانوں کی صفیں آراستہ ہیں۔
ایک لمبا تڑنگا آدمی سینہ پھلا کر دونوں ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں تک لے جاتا ہے اور منہ کو زور سے باجے کی طرح بجاتا ہے۔
آواز کے ساتھ ہی صف آرا کمانوں میں حرکت ہوتی ہے اور میرے جسم پر سنسناتے تیروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔
کچھ دیر بعد میں تیروں میں چھپ جاتا ہوں اور میری جگہ تیروں کا ایک ایسا چھتنار درخت ایستادہ ہو جاتا ہے جس کی ٹہنیوں پر تازہ خون کی بوندوں کا سفر تحریر ہوتا ہے
ہجوم خوش خوش واپس ہو جاتا ہے۔

"ارے! ــــــ وہ دیکھو!"
میں پیراں کے نرغے میں ہوں۔
وہ مجھے پُر ہول جنگل میں بے تحاشا کھینچتے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ گھنے درختوں کی سیاہ پرچھائیاں طے کرتے کرتے ایک جگہ رک کر کہتے ہیں۔
"اب تمہارا ہمیشہ کے لئے خاتمہ......"
سامنے ایک گرم اور بج بج کرتی ہوئی دلدل ہے۔
"اب تم کسی بھی طرح بچ نہیں سکو گے۔ دلدل کے یہ بُلبلے دیکھ رہے ہو؟ انہیں اپنا آخری روپ سمجھو!"
اور اب میں دلدل کے حوالے ہوں
دھنس رہا ہوں...... دھنستا جا رہا ہوں
سب بہت خوش ہیں۔

"وہ دیکھو ــــــ!"
اور ہجوم مجھ پر پتھر برساتا ہوا مجھے اس طرف لے جا رہا ہے جہاں آگ کے شعلے اپنی

پھری ہوئی زبانوں کو ادھر ادھر لپکا رہے ہیں۔

آگ کے پاس پہونچ کر وہ سب ناچنے لگتے ہیں۔ شاید اس بات پر خوش ہیں کہ کچھ لمحوں بعد انھیں مجھ سے نجات ملنے والی ہے۔ وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے انھوں نے پوری دنیا فتح کرلی ہو اور وہ دنیا میں ہوں۔

ناچتے ناچتے وہ مجھ سے بہت قریب آگئے ہیں۔

اور اب میں ان کی گرفت میں ہوں۔

بس اب کچھ ہی لمحوں بعد وہ مجھے آگ کی آغوش میں ڈال کر خوشی میں اچھلتے کودتے شہر کی طرف واپس ہو جائیں گے .... لیکن جب شہر میں داخل ہوں گے تو انھیں اپنے قریب ہی میرے قدموں کی آہٹ سنائی دے گی' اور اس بات کا احساس ہوگا کہ میں ان کے درمیان ہی کہیں موجود ہوں۔ شاید وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ہر قتل کے بعد میرا قد کچھ اور اونچا ہو جاتا ہے۔

میں: مستحکم، مضبوط، سخت، کھردرا اور اٹل!

سیاہ آب آتش پا

یہ وہ گاؤں ہے جہاں سب کے خوابوں میں اور سب کے تصورات میں ایک بہت ہی خوبصورت ندی بہہ رہی ہے۔ چاندی کی زنجیر کی طرح چھم چھم کرتی اور کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح بلکھاتی لہراتی ہوئی۔ یا جیسے ایک برہنہ شمشیر کہ آنکھوں میں چمک چمک اٹھتی ہے اور بہت سارے دل اداسیوں کے جنگل میں جگنوؤں کی طرح بجھنے لگتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان حسرت بھری باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

"کاش ہمارے گاؤں میں بھی ندی ہوتی' ایک خوبصورت سی ندی جس کے کنارے دھان کے کھیت لہلہاتے' کنول اور گیندے کے پھول کھلتے' ہری ہری گھاس پر تتلیوں کا رقص ہوتا اور گاؤں کی خوبصورت لڑکیاں اس ندی کے شفاف پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتیں۔ کتنا حسین منظر ہوتا وہ؟"

"پتہ نہیں یہ گاؤں یہاں کس بے وقوف نے بسا دیا۔ ایک ندی کے نہ ہونے سے ہم کتنی ساری نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کنوئیں کا نمکین پانی پی پی کر ہم بدھو ہوتے جا رہے ہیں۔"

"اگر ندی ہوتی تو ہم چاندنی رات میں اس کا نظارہ بھی کرتے۔"

"تو کیا اسی طرح گزارہ بھی کرتے؟ بھئی معرف کی بات کرو۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم چاندنی رات کو اپنی سسرال سمجھتے ہو لیکن یہاں مسئلہ چاندنی رات کا نہیں ندی کا ہے۔"

"ندی نہ ہونے سے ہم خربوزہ اور تربوزنا اگانے سے محروم ہو گئے ہیں۔"

"ابھی اپنے ان بھاڑیوں کا تذکرہ مت کرو۔ یوں کہو کہ ہم گیہوں اور چنے کی فصلیں نہیں اگا سکتے۔"

"صرف برسات کے سہارے تو کھیتی باڑی نہیں کی جا سکتی۔ گذشتہ کئی سال سے بارش ٹھیک

تنہیں ہو رہی ہے۔ پچھلے سال ہماری سب فصلیں دھوپ میں جل گئی تھیں۔ ہم دوسروں کے محتاج ہوتے جا رہے ہیں اگر اس گاؤں میں ندی ہوتی تو پڑوس کے گاؤں کی طرح ہم بھی ترقی کرتے۔ تم سب جانتے ہو کہ اس گاؤں پر سونا برستا ہے کیونکہ وہاں ایک بہت ہی چھیل چھبیلی ندی بہتی ہے۔

• چھیل چھبیلی :

• ہاں بلکہ سنگ دل اور سفاک بھی کہ ہمارے گاؤں کو اس نے کبھی قابل نہیں سمجھا۔

• میں نے سنا ہے کہ اس ندی میں مچھلیاں بہت ہیں۔

• ہاں —— اتنی کہ اس ندی سے جو نہریں نکالی گئی ہیں ان کے ذریعے بھی بہت ساری مچھلیاں کھیتوں تک پہونچ جاتی ہیں۔ خیر مچھلیوں کی بات چھوڑو، انہیں سمجھتا ہی کون ہے۔ اس ندی کی وجہ سے وہ گاؤں ہر وقت سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ گیہوں، چاول، سبزی ترکاری، پھل پھول سب کچھ وہاں موجود ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ وہاں باغات کتنے گھنے گھنے ہیں اور اس کے برخلاف ہمارا گاؤں "روکھا سوکھا زرد، بنجر جیسے تمہارا چہرہ۔"

• میرا چہرہ بنجر نہیں ہے ذرا اپنے سر کو تو دیکھو۔

• ہمارے گاؤں میں رہنے والے بہت سے لوگ پڑوس کے گاؤں میں کام کرنے کے لئے جاتے ہیں یہ ہماری توہین ہے۔

• یہ توہین تو برداشت کرنی ہی پڑے گی کیوں کہ ہمارے گاؤں میں ندی نہیں ہے۔

• ہمیں چاہیئے کہ اس گاؤں کو کہیں اور بسائیں جہاں کوئی گہری اور تیز ندی ہو۔

• یہ ناممکن ہے۔ ہم یہاں سے گھر تو لے جا سکتے ہیں لیکن اپنے کھیت، اپنی زمین نہیں لے جا سکتے جن پر ہمارے اجداد نے اپنا خون پسینہ ٹپکایا ہے۔

• تو اب صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

• کاش کبھی ایسا ہو کہ ہماری اس سرزمین سے کوئی چشمہ پھوٹ پڑے جو رفتہ رفتہ ایک پاٹ دار ندی کی صورت اختیار کر لے۔ پھر تو ہمارے گاؤں کی قسمت ہی بدل جائے گی۔

• تب تو ہم مچھلی بھی پال سکیں گے۔

• خواب دیکھتے رہو۔ ممکن ہے کبھی خوابوں میں سمندر بھی نظر آجائے۔

شاعری ؟ —— (نہیں)

شادی ؟ —— (ہرگز نہیں!)

پھر...... ؟ آہا' اب بات سمجھ میں آگئی..... فرار۔ چلو سالے کو دوسرے شہر بھاگ جاتے ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔ اسے کہتے آزادی' چھٹکارا' نجات' الوداع اے نگ والو اب ہم چلے۔ بہت دور چلے۔

لیکن نہیں! ہرگز نہیں!!

کیا فائدہ دوسرے شہر جا کر۔ لڑکیاں تو وہاں بھی ہوں گی۔

شیشہ سوارِ شب

پھر رات جب تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

اور تمام گلیاں خوابوں کے بھنور میں ڈوب جاتی ہیں اور گہرا اندھیرا سناٹے سے ہم آغوش ہو جاتا ہے تو کسی بھی گلی کے کسی بھی گھر سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھرتی ہے۔

"چھناک ...... چھن چھن"

آس پاس کے لوگ چونک اٹھتے ہیں۔ خبر گشت کرنے لگتی ہے اور پھر یکے بعد دیگرے تمام گلیاں جاگ اٹھتی ہیں۔ لوگ ہاتھوں میں لاٹھی، پتھر، سلاخیں وغیرہ لئے گلیوں میں پھیل جاتے ہیں؛ اِدھر اُدھر دوڑتے ہیں، شور کرتے ہیں اور پھر تھک ہار کر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔

"آج پھر ایک شیشہ ٹوٹا۔ سمجھ میں نہیں آتا کون ایسی حرکت کر رہا ہے۔ بس..... بس اب تو برداشت سے باہر ہو گیا ہے...... میرے بدن میں زلزلہ آ رہا ہے۔ اُف! میں کتنے غصہ میں ہوں۔"

"اگر وہ شیشے توڑنے والا مجھے مل جائے تو میں اس سلاخ سے اسے بھی ریزہ ریزہ کر دوں گا۔ میرے اندر طوفان اٹھ رہا ہے۔"

"ہم اُسے ایسی سزا دیں گے کہ وہ......"

"بس بس بہت ہو چکا۔ ہم کتنے دنوں سے اس کے لئے اسی طرح ہوائی گھوڑے دوڑا رہے ہیں لیکن ابھی تک پتہ بھی نہیں چل سکا کہ وہ کون ہے، وہ ہمیں مسلسل شکست دے رہا ہے۔ ہمارے ہتھوڑوں ہاتھ میں لیکن ہم اسے پکڑنے میں ناکام رہے۔ اگر یہی حال رہا تو کل ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"دنیا کی بات چھوڑو دنیا تو فانی ہے بھائی۔ یہ بولو کہ کل ہم خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"وہ ہمارا مذہبی تہذیبی اثاثہ گنوا رہا ہے۔ ہم کتنے دنوں سے چین کی نیند نہیں سو سکے۔ ہمارے گھروں کی دلکشی ختم ہوتی جا رہی ہے۔"

ان شیشوں سے ہمارے گھر جگمگ کرتے ہیں۔ ہم باہر کی ہوا اور دھول سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ رنگ برنگے شیشے ہمارے گھروں کی بہترین سجاوٹ اور آرائش کا کام کرتے ہیں۔ انہیں چکنا چور کر کے وہ ہمارے گھروں کے وقار اور خوبصورتی کو مسخ کر رہا ہے۔ ہم اب زیادہ صبر نہیں کر سکتے۔"

لیکن وہ ہے کون جو شیشوں سے جنگ کر رہا ہے؟

"ہم شیشہ بردار ہیں تو وہ شیشہ شکن۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہم سے اختلاف کر رہے ہو۔"

"نہیں تو۔ میرا مطلب ہے وہ ہم سے تضاد کر رہا ہے۔ وہ یقیناً کوئی شاعر ہوگا کیونکہ شاعروں کو شیشوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔"

"وہ تو بے چارے صرف جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کاتب کی ذرا سی خطا تو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا توڑ پھوڑ کا عمل ان سے ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے وہ کوئی وحشی ہوگا۔"

"ہمیں اس کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ آج سے ہر کوئی چوکس رہے۔"

اور ہر رات سب چوکس رہنے لگے۔ ادھ کھلے دروازوں میں سے جھانکتے ہیں، ہر آہٹ کو بغور سنتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہیں۔

"چوکس رہو ——— بھاگنے نہ پائے!"

"جاگتے رہو ——— توڑنے نہ پائے!"

لیکن اتنا چوکس رہنے کے بعد کسی بھی گھر سے "چھناک ..... چھن چھن" کی آواز آ ہی جاتی ہے ——— دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ گلیاں روشن ہونے لگتی ہیں اور سب ادھر اُدھر گھوڑوں کی طرح سرپٹ دوڑتے ہیں۔ مگر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سب دوسری شب کے لئے عہد کرتے ہیں کہ کل تو اسے ضرور پکڑ لیں گے لیکن اس شب بھی شیشہ ٹوٹ جاتا ہے اور کوئی سایہ بھی نظر نہیں آتا۔

"یا تو ہم اندھے ہو گئے ہیں یا ہمارے گھروں کے مقدر ہی پھوٹ گئے ہیں۔"

"وہ ضرور کوئی مافوق الفطرت ...."

"بکواس مت کرو۔ جس دن وہ میرے ہاتھ آگیا سمجھو کہ وہ اس کا آخری دن ہوگا۔"

"اُف! اب تک کتنے شیشے ٹوٹ چکے ہیں۔ گھر بے ہنگم ہوئے جارہے ہیں معاملہ خاصا غلط بھیا ہے۔ آخر ہم کیا کریں؟"

"ہمیں چاہیئے کہ ہم فوراً ایک ہنگامی اور مشورتی مجلس کا اہتمام کریں اور اس میں سر جوڑ کر سوچیں کہ اپنے گھروں کے شیشوں کو ان جارحانہ حملوں سے کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہم کتنے دنوں سے اپنے ٹوٹے ہوئے شیشے سمیٹ رہے ہیں۔ سب طرف کرچیاں پھیل رہی ہیں۔ ہمارے دیدہ زیب گھر بے رونق اور بے کشش ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں فوری طور پر قدم اٹھانا چاہیئے ورنہ کل یہ سارے گھر اصطبل اور دھول گھوٹ جیسے ہو جائیں گے اور ہم ......"

"الفاظ کا استعمال محتاط ہو کر کرو۔ ایسے الفاظ مت کہو جس سے ہم خود مجروح ہوں۔"

"مشورے کا شکریہ! میں ایک بے باک مقرر ہوں۔ میں جب زورِ بیان پر آتا ہوں تو مجمع میں بہت سے لوگوں کی ٹوپیاں اور پگڑیاں اچھل جاتی ہیں۔"

"تمہاری تقریر پر تو میں نے جوتے اور سینڈل بھی اچھلتے ہوئے دیکھے۔"

"تم مجھ سے بحث نہیں کرسکتے۔ مجھے تمہاری صلاحیت کی حقیقت معلوم ہے۔ بھول گئے وہ دن جب تمہیں خط کا جواب تک لکھنا نہیں آتا تھا اور تم نے اپنی محبوبہ کو ایک سے لے کر سو تک کی گنتی لکھ کر بھیج دی تھی۔"

"ساتھیو! آپس میں بحث مت کرو۔ یہ وقت اتحاد اور اتفاق کا ہے۔ بولو کیا اس بات سے متفق ہو کہ ہم ایک مشورتی مجلس کا انعقاد کریں؟"

"ہاں ہاں، ہم متفق ہیں۔" ہر طرف سے پرجوش آوازیں آتی ہیں اور سب لاٹھیاں اور سلاخیں بلند کئے ایک دوسرے سے اور قریب آجاتے ہیں۔ "آہا! ہم کتنے قریب ہیں۔"

"خدا نے چاہا تو اب ہم اس بلائے ناگہانی سے نجات حاصل کرلیں گے۔"

"اب تو وہ میری سلاخ کی زد میں ضرور آئے گا......"

"ساتھیو! آواز دو، ہم ایک ہیں۔"

"چوکس رہو ——— بھاگنے نہ پائے:
"جاگتے رہو ——— توڑنے نہ پائے:"

"انقلاب! زندہ باد!!"
سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔
"یہ انقلاب کا نعرہ یہاں کس بے وقوف نے لگادیا؟"
"وہی ہوگا...... صاحب زور بیان:"
"...... تو ساتھیو کل شب ہم یہیں جمع ہوں گے اور اس مسئلہ پر غور کر کے کوئی مناسب قدم اٹھائیں گے تاکہ ہمارے شیشے نسل در نسل محفوظ رہیں:"
سب نہایت خوش خوش اپنے گھروں میں واپس ہوتے ہیں۔ دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ سب بستروں پر پہنچ جاتے ہیں لیکن خود رخوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔
"آخر کون ہے جو شیشے توڑ رہا ہے؟ اسے ہمارے گھروں سے یا ہمارے شیشوں سے کیا دشمنی ہے۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ ہوائیں ہمیں تنگ کریں۔ دھول ہمارے گھروں میں گھس آئے اور بارش کی بوچھار اندر کا نقشہ بدل دے۔ لیکن وہ ہاتھ کیوں نہیں آتا۔ کسی کو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ کیا وہ کوئی قہر ہے، جادو ہے، یہ چھناک چھن چھن کی آواز کب بند ہوگی؟"
ہنگامی اور مشورتی مجلس ابتدا میں نہایت پر جوش اور طوفان انگیز ہوتی ہے۔ سب نہایت ہمت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں، تجویزیں پاس کرتے ہیں مگر رفتہ رفتہ بات کا بہاؤ دوسری سمت ہو کر مناقشہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے
"یہ سب ایٹمی تجربات اور دھماکوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔"
"فضا زہر آلود ہو رہی ہے اس کا اثر ہر شئے پر پڑ رہا ہے۔ شیشے تو بہت حساس ہوتے ہیں۔"
"میں ماہر روحانیات ہوں۔ کیا تم آسیب پر یقین رکھتے ہو؟"
"تمہیں دیکھتا ہوں تو کچھ کچھ یقین آنے لگتا ہے۔"
"ساتھیو یہ مشورتی مجلس ہے۔ موضوع سے خارج باتوں سے اجتناب کیجئے۔ لیکن آسیب کا شیشوں سے کیا تعلق۔ یہ مخفی مسئلہ ہے۔"

"مشینی جذبات خود ایک آسیب ہے جو انسان کے جسم میں سرایت کر چکا ہے؟"

"لگتا ہے تم شاعری کرنے لگے ہو؟"

"شاعری کا مشینی عہد سے کیا تعلق؟ وہ اتنی لطیف شئے آہنی ولولوں کے پُرزوں کی گھن گرج کو کیا سمجھے گی؟"

"شاعری مشینیں نہیں ڈھالتی۔ وہ انسانی جذبات اور احساسات کو بیان کرتی ہے؟"

"شاید اسی لئے انسان کی سمجھ سے باہر ہوتی جا رہی ہے؟"

"ساتھیو یہ ادبی و تنقیدی مجلس نہیں ہے۔ ہنگامی اور مشورتی مجلس ہے اور ہم یہاں شیشوں کی بازیابی کے لئے جمع ہوئے ہیں؟"

"بازیابی کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے۔ بازیافت کہو؟"

"ایسا لگتا ہے یہاں سب صاحب زبان بیٹھے ہیں' خیر آپ لوگ اور کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ــــ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شیشے کوئی انجانی طاقت توڑ رہی ہے۔ اس دنیا میں بہت سی ایسی مخلوقات بھی ہیں جنہیں ہم دیکھ نہیں سکتے؟"

ہمیں تو تم بھی دکھائی نہیں دے رہے ہو۔ کہاں ہو؟ ذرا ادھر اجالے میں آؤ.....

اچھا تو پھر ـــــ!"

"شیشے توڑنے کی یہ کارستانی اُسی طرف سے ہو رہی ہے۔ ہماری گلیوں میں وہ مخلوق ضرور موجود ہے جو ہم سے جنگ کر رہی ہے؟"

"سراسر وہم۔ اس مخلوق سے کہو کہ ہتھیار ڈال دے ورنہ اسے ہڈیوں اور کوئلے کا دیدار بھی نصیب نہ ہوگا۔ یہ ذہین' باشعور اور ترقی یافتہ لوگوں کی گلیاں ہیں۔ ساتھیو۔ آج سے تمام گلیوں میں پہرے لگا دئے جائیں۔ ہر گلی میں چند لوگ پہرے دیتے رہیں تاکہ کوئی بھی ہماری گلیوں میں داخل نہ ہو سکے۔ مجھے یقین ہے بہت جلد ہم معاملے کی تہہ تک پہونچ جائیں گے اور ہمارے شیشے......"

اچانک کہیں قریب ہی سے ایک تیز آواز ابھرتی ہے۔

"چھناک ـــــ چھن چھن"

جلوس میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔

"بھاگنے نہ پائے ــــ توڑنے نہ پائے"

سب ادھر اُدھر دوڑ پڑتے ہیں۔ گلیوں میں شور پھیل جاتا ہے۔

"کون ہے وہ مائی کا لال۔ سامنے آئے۔ ارے یہ ڈنڈا دیکھا کیا؟"

مگر کہیں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ اندھیرا...... گہرا اندھیرا اور کہیں کہیں اُجالا۔

"اُف۔ اُدھر کتنا اندھیرا ہے...... گہرا گہرا...... کالا کالا"

سب فوراً اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ بتیاں بجھ جاتی ہیں اور گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔

رات پھر آتی ہے۔

شیشے پھر ٹوٹتے ہیں۔

سب پھر جمع ہوتے ہیں۔

"دوستو۔ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کب تک یہ تماشہ دیکھتے رہیں گے۔ ہمارے گھروں پر یہ کیسا قہر نازل ہو رہا ہے۔ ہم اتنے کمزور کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ کون ہے جو ہم پر مسلسل حملے کر رہا ہے۔ ہمارے گھر تو بے کشش کھو کر کھنڈر نما ہو رہے ہیں اور ہم نیند سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ہر رات ہمیں کھٹکا لگا رہنے لگا ہے۔ شیشوں کی آبرو نیلام ہوتی جا رہی ہے۔ ہم سراپا درد میں ڈھل رہے ہیں ہمیں چاہیئے کہ ایک بار پھر اپنی ہمت کو آواز دیں۔ اپنی طاقت کو للکاریں اور حملہ آور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اس عتاب سے محفوظ رہیں۔"

"تمہیں آنے والی نسلوں کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے۔ ممکن ہے وہ بے حس پیدا ہوں۔ تم کافی روایت پسند ہوتے جا رہے ہو۔"

"تم لوگ پھر بحث کرنے لگے۔ چلو اٹھو کر گلی میں پہرہ دو۔ ایسا لگتا ہے کوئی ٹھیک طرح سے پہرا نہیں دے رہا ہے۔ ارے! وہ دُور کوئی سی شئے حرکت کر رہی ہے۔ کالی کالی سی....."

"آم کا درخت ہے۔"

"آم کا درخت؟ چوکس رہو بھاگنے نہ پائے! جاگتے رہو توڑنے نہ پائے!!"

شور مچ جاتا ہے۔ لوگ ڈنڈے اور سلاخیں لیے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

"کہاں ہے وہ مردود!"

"ارے بھائی وہ آم کا درخت ہے۔ لیکن ابھی نعرہ کس نے لگایا تھا؟ ایسا لگتا ہے ہم ذہنی طور پر تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارا باطنی توازن کہاں چلا گیا۔ افسوس یہ سب شیشوں کی محافظت میں ہو رہا ہے۔ ہم کتنی طاقتوں سے مر نہیں سکتے ہیں۔ ایک ایک کر کے سبھی شیشے ہم سے جدا ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ رنگ برنگے چمکتے ہوئے شیشے جو سورج کی کرنوں کا انعکاس کر کے ہلا سر فخر سے بلند کرتے تھے ریزہ ریزہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے گھر ظاہری کشش کھو رہے ہیں۔ اب ہم کیا کریں۔ کیا وہ آم کا درخت پہلے بھی وہاں موجود تھا؟"

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"چھناک ـــــ چھن چھن"

ہر شب آواز منفرد اٹھتی ہے۔ ایک مہیب پراسرار اور ان دیکھا وجود سب کے ذہنوں پر مسلسل جالے تانتا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ ایک دیو پیکر خیال میں ڈھل کر ابھر رہا ہے۔

اب شیشہ ٹوٹنے کی آواز آتی ہے تو کوئی گھر سے باہر نہیں آتا۔ کوئی شور نہیں ہوتا۔ کوئی نعرہ بلند نہیں ہوتا۔ بلکہ سب لحافوں میں اور اچھی طرح دبک جاتے ہیں۔

اور ان کے سوچنے کا انداز بھی بدلنے لگا ہے۔

"اگر ہم ان شیشوں کا ماتم کرتے رہیں گے تو ایک دن کھوکھلے ہو جائیں گے۔ گلیاں قبرستان بن جائیں گی اور ہماری آنے والی نسلیں بے حس اور اپاہج کے مقبرے میں رہیں گی۔"

"ان شیشوں نے ہمارے مقدر شب و روز کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ گھروں پر کرچیوں کا موسم اتارتے ہیں۔ اور اب تو کوئی شیشہ سلامت نہیں۔ لہذا ہم گھر کی مانند سے بنائیں گے۔ اندر کافی خوبصورت گلیاں ہیں۔ جہاں کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔"

"ہمیں خواب دیکھنے کے علاوہ سوچنا بھی چاہیے اگر مسلسل دو تین سال تک بارش نہیں ہوئی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"مگر میں کہتا ہوں یہ گاؤں یہاں کس بے وقوف نے بسا دیا؟"

"پھر وہی بات۔ ممکن ہے سینکڑوں سال پہلے یہاں کوئی ندی رہی ہو۔"

"تو پھر وہ کہاں گئی؟"

"بعض مرتبہ حمید نے۔ لگتا ہے تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔ جاؤ سو جاؤ۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بہت سی ندیوں کو سورج اٹھا لیتا ہے یا ہوا اڑا لے جاتی ہے اور بہت سی ندیاں زمین میں دھنس جاتی ہیں جیسے کہ وقت!"

"سنا ہے یہاں بہت پہلے کبھی ایک برساتی نالہ تھا۔"

"وہ تو اب بھی ہے مگر برسات میں بھی خشک رہتا ہے۔ کیا گاؤں سے قریب تم نے اس کے نشانات نہیں دیکھے؟"

"ہمارے گاؤں سے لگ کر جو سڑک جاتی ہے اگر وہ ندی بن جائے تو کیسا رہے۔"

"لگتا ہے تم بھی ہوش میں نہیں ہو۔ جاؤ تم بھی سو جاؤ۔ ارے بھئی اگر سڑک ندی بن جائے تو موٹر گاڑیاں اور تانگے کیا تمہارے سر پر چلیں گے؟ ہونہہ بات کرتے ہو۔"

"ابھی صبح میں نے ایک گذرتے ہوئے ٹرک کو دیکھا تھا اس کے پیچھے لکھا ہوا تھا بُری نظر والے تیرا منہ کالا۔"

"تم شاید مجھ پر طنز کر رہے ہو لہٰذا میں نے بھی ایک ٹرک دیکھا تھا جس پر لکھا ہوا تھا اڑے او جلنے والے اپنی پگڑی سنبھال۔"

"بھئی تم لوگ الجھو مت...... دراصل ہم ندی کے لئے اتنے خواب دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں ہر چیز میں ندی ہی نظر آتی ہے۔"

"ممکن ہے کل تمہیں اپنی بکری میں بھی ندی نظر آجائے۔"

"اُف! پڑوس کے گاؤں کی ندی میں کتنی مچھلیاں ہیں۔ چاندنی رات میں خوب چمکتی ہوں گی۔ کل رات میں نے خواب میں بہت بڑی مچھلی دیکھی تھی۔"

"لگتا ہے یہاں میرے سوا کوئی بھی ہوش میں نہیں ہے۔ لہٰذا میں خود سونے جا رہا ہوں......"

گاؤں والوں کے درمیان اس قسم کی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ اپنی اپنی صلاحیت کے مظاہرہ میں کبھی کبھی حجت اور تکرار بھی ہو جاتی ہے لیکن ندی کے خطاب اور تعصب نے انھیں ایک مضبوط زنجیر میں جکڑ دیا ہے اور پورا گاؤں ایک خاندان سا بن گیا ہے۔ دن بھر کنوئیں کا پانی کھینچتے رہنے کے بعد جب شام میں نڈھال اٹھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کھیتوں کے بہت سارے حصوں تک پانی نہیں پہونچ سکا ہے۔

پھر وہ دیکھتے ہیں کہ آسمان سے ایک گونج دار آبشار ڈولتا ہوا اُتر رہا ہے۔

جس میں بے شمار سنہری مچھلیاں ہیں اور آبشار اتنی تیزی سے اتر رہا ہے کہ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں بھی اس کی لپیٹ میں چلی آ رہی ہیں اور وہ جگمگ جگمگ کرنے لگا ہے۔ پھر محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیچے اُتر کر کھیتوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہا ہے اور افق تا افق پانی ہی پانی چمک رہا ہے۔ کھیت سبز ہو رہے ہیں مگر پھر احساس ہوتا ہے کہ آسمان پر تارے چمک رہے ہیں اور نیچے پُر ہول تاریکی ہی تاریکی ہے۔

پھر اچانک یہ خیال آتا ہے کہ برسات کا موسم تو کب سے شروع ہے مگر پانی کی ایک بوند بھی نہیں ٹپکی اور ہم ہیں کہ خواب دیکھ رہے ہیں۔

کافی انتظار کے بعد ایک آدھ بارش ہوتی ہے۔ گاؤں میں خوشیوں کی باڑھ آ جاتی ہے۔

"میں کہتا ہوں اس سال بہت زبردست بارش ہوگی' اتنی زبردست کہ زمین میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور اس کے سینے کے سارے چشمے' ساری ندیاں باہر آ جائیں گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ قدرت ہم پر ضرور مہربان ہوگی۔"

مگر بارش نامناسب ہوتی ہے اور موسم کھیتوں کو زرد کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ خواب پھر نظر آنے لگتے ہیں۔

اور بہت دن گزر جاتے ہیں۔

"مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی ندی ہمارا گاؤں تلاش کر رہی ہے۔ میں جب سوتا ہوں تو مجھے

بہتی ہوئی ندی کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں :

"مجھے تو لگتا ہے یہاں زیر زمین کوئی بہت گہری ندی ہے' اسے برآمد کرنا چاہیئے۔"

"میں کہتا ہوں تم لوگ کب تک خواب دیکھتے رہو گے ؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ خواب دیکھ دیکھ کر تمہاری شکلیں خرگوشوں جیسی ہوتی جارہی ہیں !"

"خرگوشوں جیسی ؟ میاں ذرا تمیز سے بات کرو۔ اگر ہم خواب نہیں دیکھیں گے تو ہمارے حوصلے ٹوٹ جائیں گے پھر ہم کنوئیں سے پانی بھی نہیں کھینچ سکیں گے۔ خواب ہی تو ہماری زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔"

"ہمیں خواب دیکھنے کی بجائے کچھ سوچنا بھی چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے' میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کہو۔ مگر یاد رکھو' بیچ میں چاندنی رات کا تذکرہ ہرگز مت کرنا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔"

"لیکن مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ ایک بات بہت دنوں سے میرے ذہن میں گردش کر رہی ہے۔"

"کون سی بات ؟"

"اگر تم لوگ ساتھ دو گے تو ہمارے خواب حقیقت میں بدل جائیں گے۔"

"وہ کس طرح ؟"

"ہمیں چاہیئے کہ ہم پڑوس کے گاؤں کی ندی کو بھگا لائیں۔"

"بھگا لائیں ؟ کیا مطلب ؟"

"یعنی کہ اس ندی کا رخ اپنے گاؤں کی طرف موڑ دیں۔"

سب چونک اٹھتے ہیں۔ حیرت اور مسرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ خوشی میں کچھ چیخیں بلند ہو جاتی ہیں۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں میں بہت دنوں سے غور کر رہا تھا اور میں نے بہت کافی محنت کر ڈالی۔ ہمارا گاؤں ڈھلان پر ہے۔ ہم ایک ہی رات میں اس ندی کا رخ اپنے گاؤں کی طرف کر سکتے ہیں۔ مشرقی سمت سیاہ چٹانیں ہیں جہاں سے وہ ندی پڑوس کے گاؤں کی طرف چلی گئی ہے۔

ہمیں صرف ایک چٹان بارود سے اڑانا پڑے گی۔ کل صبح کچھ لوگ میرے ساتھ اس مقام پر چلیں۔ لیکن وہاں تک پہونچنے کے لئے کچھ گھوڑوں کا انتظام کر لیا جائے۔ اگر ہم سب ندی کی محنت اور ہمت کا مظاہرہ کریں تو وہ ندی ہمارے پاس ہوگی۔"

"ندی کے لئے تو ہم سب جان دے سکتے ہیں۔"

اور اندھیرے میں سب دیکھتے ہیں کہ لاتعداد گھوڑے پانی میں دوڑ رہے ہیں۔ پانی اڑ رہا ہے۔ مچھلیاں ادھر اُدھر بھاگ رہی ہیں۔ ریت پر بگلے شور مچا رہے ہیں اور آسمان سے ایک آبشار بہت دودھیا ہوا اتر رہا ہے۔

"یہ آبشار یقیناً آنے والے دنوں کی خوش گوار علامت ہے۔"

سورج طلوع ہوتے ہی وہ گھوڑوں پر سوار مشرقی سمت سیاہ چٹانوں تک پہونچ جاتے ہیں۔ اوپر چڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دوسری سمت بھری پُری ندی چمک رہی ہے اور قوس کی شکل میں چٹانوں سے لگ کر لہراتی ہوئی پڑوس کے گاؤں کی طرف چلی گئی ہے۔

"ندی اے ندی! تجھے سلام۔" وہ شوق و مسرت سے ندی کو آنکھوں میں کھینچ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

"دیکھو یہ درمیانی چٹان اگر توڑ دی جائے تو ندی کا پانی ہمارے گاؤں کی طرف چل پڑے گا۔ پڑوس کا گاؤں یہاں سے بہت دور ہے لہذا ہماری کاروائی کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوسکے گی۔ یہ خشک برساتی نالہ دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں لیکن یہ تو بہت زمانے سے خشک ہے۔ اب تو اس میں جھاڑیاں اگ آئی ہیں۔"

"ہاں لیکن یہی خشک نالہ اس ندی کو ہمارے گاؤں تک پہونچائے گا کیوں کہ یہ سیدھا ہمارے گاؤں کی طرف گیا ہے۔"

"اے واہ!" وہ خوشی میں ناچنے لگتے ہیں۔ "ٹھیک ہے ہم آج ہی شہر جاکر بارود لے آتے ہیں۔"

"دیکھو دیکھو ندی میں مچھلیاں چمک رہی ہیں۔"

"اور یہاں تمہاری آنکھیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ ہم بھی شیریں کی طرح جنوں پسند ہیں۔"

"کون شیریں ؟"

"تم نے وہ قصہ سنا نہیں کیا ؟ فرہاد اس کی محبوبہ تھی۔"

"تمہارے دماغ میں مچھلیاں گھس گئی ہیں۔ فرہاد اس کی محبوبہ نہیں بلکہ محبوب تھا۔"

وہ ہنستے گاتے دھوم مچاتے ہوئے واپس ہوتے ہیں۔

پورا گاؤں سرگرم ہونے لگتا ہے۔

شہر سے ڈھیر سارے بارود اور پٹاخے آجاتے ہیں۔

اور گھوڑے چٹانوں کی سمت پھر دوڑتے ہیں۔

سرنگیں تیار ہونے لگتی ہیں ——— بارود بھر دیئے جاتے ہیں۔

"آج رات کے آخری حصہ میں جب صبح کا ستارا چمکے گا ہم یہ درمیانی چٹان اڑا دیں گے۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکے گا اور یہاں سے ایک ایسا دروازہ کھلے گا جو ہمارے گاؤں کی قسمت پلٹ دے گا۔"

"بے شک ! لیکن مجھے ڈر ہے۔ ندی کا رخ بدلنے پر کہیں پڑوس کے گاؤں والے ہم سے جھگڑا نہ کریں۔"

"جھگڑا کیوں کریں گے۔ ہم اسے اتفاقی حادثہ قرار دیں گے۔ ویسے ہم نے یہ سارا کام اس طرح کیا ہے کہ انھیں احساس بھی نہ ہو سکے گا۔ ہم صبح ہونے سے پہلے ہی اس ندی کا اغوا کر لیں گے۔"

"اغوا ! مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ ندی بھی کوئی لڑکی ہی ہے۔"

"تم تو فرہاد کو بھی لڑکی ہی سمجھ رہے تھے۔"

"آہا ! کیا خوب چاندنی رات ہے۔"

صبح کا ستارا نمودار ہوتے ہی گھوڑے اچانک ہنہنا کر سرپٹ دوڑتے ہیں اور پے در پے دس بارہ دھماکے ہوتے ہیں۔ درمیانی چٹان منتشر ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ وہ گھوڑے روک لیتے ہیں اور پھیلی ہوئی چاندنی میں دور سے دیکھتے ہیں کہ درمیانی چٹان بکھر گئی ہے۔ دروازہ کھل چکا ہے اور ندی کا پانی اچھلتا، کودتا اور شور مچاتا ہوا نشیب میں دوڑنے لگا ہے۔ وہ خوشی میں پاگل سے ہو جاتے ہیں۔ گھوڑے سے اتر کر ایک دوسرے سے لپٹ کر نعرے لگاتے ہیں، ناچتے ہیں، جی کھول کر ہنستے ہیں

سیپا ہوا سلطو ؟

اور دوڑتے ہوئے پانی کے ساتھ خود بھی دوڑنے لگتے ہیں۔

پانی خس و خاشاک کو پیٹتا ہوا، کہیں خم کھاتا، کہیں جھاڑیوں اور درختوں سے ٹکراتا ہوا بہت تیز چلتا ہے۔

وہ پھر گھوڑوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔

"لگتا ہے پوری ندی ہمارے ساتھ ہے"

"پانی کا رُخ سیدھا ہمارے گاؤں کی طرف ہے"

"مجھے ڈر ہے کہیں آگے جا کر یہ اپنا بہاؤ نہ تبدیل کر دے"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جو خشک برساتی نالہ ہمارے گاؤں کی طرف گیا ہے ندی اسی میں دوڑ رہی ہے"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو"

"دیکھو سورج نکلنے والا ہے۔ ہمارے گاؤں کا پہلا سنہرا دن جو سب کو خوشیوں میں پاگل کر دیگا ہمارے کھیت اب ہمیشہ سبز رہیں گے۔ نمکین پانی والے کنوؤں کو ہمارا آخری سلام..................

اے گاؤں والو! اٹھو، دیکھو ندی آرہی ہے .... ندی آرہی ہے ....

ندی آرہی ہے!"

ندی نہایت پُرجوش انداز میں گرجتا اور غرّاتی ہوئی سیدھی گاؤں میں گھس جاتی ہے۔ شور مچ جاتا ہے۔ لوگ گھروں سے نکل بھاگتے ہیں۔ ندی نہایت شان سے بہت سارے گھروں کو اُجاڑ کر اور بہت سارا مال و متاع اپنی پیش رو موجوں میں لپیٹ کر آگے نکل جاتی ہے۔ بہت سا سامان پانی میں تیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لوگ ندی میں اتر جاتے ہیں۔ کچھ سامان ہاتھ آتا ہے۔ باقی بہہ جاتا ہے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ خوشی منائیں یا آنسو بہائیں۔"

"ہمیں خوشی منانا چاہیئے کیوں کہ کچھ کھو کر ہم نے بہت کچھ پایا ہے۔"

"مگر میری تو ساری مُرغیاں بہہ گئیں"

تمہاری ساری مرغیاں گڑ کر گئیں۔ یہ ندی تمہیں بہت ساری مچھلیاں دے گی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم نے جو کھو دیا ہے اس کا افسوس نہ کریں۔ جو گھر اجڑ گئے ہیں انہیں دوبارہ بسا سکیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارا گاؤں اب مکمل طور پر بدل جائے گا۔ ندی کنارے دھان اور گیہوں کے کھیت لہلہا رہے ہوں گے۔ کنول اور گیندے کے پھول کھلیں گے اور ہم چاندنی رات میں اس کے کنارے کنارے گھومتے پھرتے بہت دور نکل جائیں گے"

"اتنی دور مت چلے جانا کہ واپس ہی نہ آ سکو۔ یہ ندی صرف ٹہلنے کے لئے نہیں لائی گئی ہے۔ یہ ہمارے خوابوں کو حقیقت کا لباس دے گی۔"

"بے شک، یہ ندی ہمارے مستقبل کو سرسبز کر دے گی۔ اب یہاں دھن برسے گا۔ اس گاؤں میں صدیوں سے خاک اڑ رہی تھی۔ مگر اب یہاں گھنے باغات ہوں گے۔ سبزی ترکاریاں، مچھلیاں، پھل پھول، اناج وغیرہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ کون کہتا ہے کہ وقت کو پکڑا نہیں جا سکتا؟"

"لیکن میرے اندر ایک خوف سا ابھر آیا ہے۔ میں ذرا اور آگے دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہی کہ ندی لا کر ہم نے اپنی قسمت میں ہمیشہ کے لئے سیلاب بھی لکھ لیا ہے۔"

وہ چونک کر آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اوپر کالے کالے مہیب بادلوں کی فوج صف آرا ہو رہی ہے۔

گلابی موسم کی سیڑھی

پرندے شور کر رہے ہیں۔ (شاید صبح ہو چکی ہے)

وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو ذرا وا کرتا ہے۔ سورج کی کرنیں بند کھڑکی کے شیشوں سے گذر کر کمرے کو جگمگ کر رہی ہیں۔ وہ یوں ہی غنودگی کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے۔ سورج کی روشنی میں ہاتھ منوّر ہیں لیکن وہاں انگلیوں کی بجائے سبز پتّے چمک رہے ہیں۔ اس کی نظریں پیروں کی طرف بڑھتی ہیں وہ دیکھتا ہے کہ پیروں سے ریشم کی طرح مہین جڑوں کا ایک جال فرش پر پورے کمرے میں پھیل گیا ہے۔ ہر طرف جڑیں سرسرا رہی ہیں۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا ہے اور اپنے ہاتھوں اور پیروں کو دوبارہ دیکھتا ہے۔

"نہیں تو! پتّے یہاں کہاں۔ ہاتھ پاؤں تو اپنی صحیح حالت میں ہیں لیکن ایسا بار بار ہو رہا ہے۔"

وہ کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ کمرے میں روشنی ہے۔

وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اپنے آپ میں بہت سی لہریں ہیں۔

"میرے اندر یقیناً ایک بہت پُراسرار اور تناور درخت ہے جو بہت دنوں سے میرے وجود میں شور کر رہا ہے، جھوم رہا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کی جڑیں اکثر کمرے سے نکل کر بہت دور تک دوڑ جاتی ہیں اور اس کے پتّے سارے آسمان پر چمکنے لگتے ہیں۔ یہ درخت بہت ہی پراسرار ہے۔ اس کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں مجھ پر ایک تحیّر کی کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ یا ممکن ہے یہ خود مجھے مسحور کر دیتا ہے۔ اکثر محسوس ہوتا ہے کہ یہ درخت شاید میرے فن کی علامت بن کر

میرے وجود میں پھیل رہا ہے لیکن میرے اندر کے اس خزانے کو یہاں جانتا ہی کون ہے۔ ہر نیا عہد ایک بڑے فنکار کو دریافت کرتا ہے اور یہ درخت شاید اپنے عہد کو ہی ڈھونڈ رہا ہے جو یہیں کہیں روپوش ہے۔ کوئی ایسا زلزلہ ضرور آنا چاہیئے کہ میں پتھروں کی قید سے آزاد ہو کر چاروں سمت بکھر جاؤں...... پھیل جاؤں۔ جنگل کی تیز ہوا کی طرح۔

وہ ہوا کی تیزی کو محسوس کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

ہوا بہت ہی تیز ہے۔ جنگل سمندری طوفان کی طرح شور کر رہا ہے۔ گھاس پھوس اور پتے اڑ رہے ہیں۔ شاخیں لہرا لہرا کر ٹوٹ رہی ہیں۔ درخت اکھڑ رہے ہیں اور پتوں کا سیلاب دوڑتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ چاروں سمت پتوں کا بھنور ہے۔ اچانک ایک طرف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ بھیانک آگ۔ دھواں ہی دھواں، شعلے ہی شعلے ــــــ اور تیز ہوا آگ اور شعلوں کی باڑھ لے کر ایک ننھے منے گلاب کے پودے کی طرف بڑھتی ہے۔

وہ گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔

باہر آنگن میں برگد کے درخت کے نیچے اس کی ننھی منی بچی اپنے لگائے ہوئے گلاب کے پودے کو پانی دے رہی ہے۔

وہ سوچتا ہے "میری طرح اس بچی کو بھی پیڑ پودوں سے بہت دلچسپی ہے۔"

وہ خوش ہو کر وہیں سے چلاتی ہے۔" ابا جی! جلدی آؤ۔ دیکھو تو سہی......"

وہ اس کے قریب جاتا ہے۔

" ابا جی۔" وہ خوش ہو کر کہتی ہے۔" دیکھو آج اس پودے میں دو نئی پتیاں نکلی ہیں۔"

" ارے واہ۔ بیٹا اب تمہارا یہ گلاب کا پودا بہت جلد بڑا ہو جائے گا۔"

" لیکن ابا۔ کتنے دن ہو گئے یہ تو بڑھتا ہی نہیں ہے اور جولی نے جو پودا لگایا تھا وہ کتنا اونچا ہو گیا ہے جیسے شہیر میں۔"

" ہاں یہ سچ ہے۔" وہ سوچتا ہے۔" یہ پودا جولی کا تو ہے اور جولی کا پودا بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔"

" اور ابا جی، امی کہہ رہی تھیں کہ یہ پودا کبھی نہیں بڑھے گا کیونکہ یہاں کی زمین بنجر ہو سب ہے۔"

"بیٹا تمہاری امی تو میرے بارے میں بھی یہی کہتی ہے لیکن دیکھو اگر یہ زمین بنجر ہوتی تو برگد کا یہ درخت اتنا ہرا بھرا اور اونچا نہ ہوتا۔ ہے نا؟"

"ہاں ––– تو پھر یہ پودا بڑھتا کیوں نہیں سالا؟"

"ہاں سالا...... لیکن بیٹا فکر مت کرو۔ کسی دن میں اس کی جڑوں میں ڈھیر ساری کھاد پہونچاؤں گا۔ پھر دیکھنا......"

اور وہ خود دیکھتا ہے کہ چاروں طرف مہین جڑیں سرسرا رہی ہیں۔ آسمان پر بے شمار سے تپتے جگمگ جگمگ کرنے لگے ہیں اور ہر تپتے سے اس کا اپنا چہرہ جھانک رہا ہے۔ جڑیں سرحد بہ سرحد پھیلتی جا رہی ہیں اور وہ ایک شگفتہ، تازہ اور گلابی موسم کی سیڑھی سے اتر کر سب کی آنکھوں میں سرائت کر رہا ہے۔

اور گلاب کا پودا؟

سیڑھی اچانک کہیں سے ٹوٹ جاتی ہے۔

شام میں گھر واپس آ کر جب وہ آنگن میں برگد کے درخت کے نیچے آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتا ہے تو بچی چہرے پر ایک عجیب سا سوالیہ نشان لئے کچھ کھوئی کھوئی سی اس کے قریب آتی ہے۔

"کیا ابا جی۔ امی مجھے اٹھا کر پلنگ پر پٹخیں گی میں تب سدھروں گی؟"

"ایں؟" وہ سر اٹھا کر اس کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے۔ "ارے بیٹا تمہاری امی تو کچھ بھی کہتی رہتی ہے۔ تم دھیان مت دیا کرو۔"

"اور ابا جی، امی کہہ رہی تھیں تمہارا اور تمہارے ابا دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تو کیا ابا ہم دونوں کا دماغ خراب ہوا ہے؟"

"نہیں تو بیٹے...... اچھا یہ بتاؤ آج تم اسکول گئی تھیں؟"

"ہاں گئی تھی۔" وہ خوش ہو کر کہتی ہے۔ "مس نے آج ایک بہت اچھی پوئم یاد کروائی ہے۔

"Here We go round the mulberry bush"

"واہ بیٹا شاباش۔"

"ابا جی آج گملے کے پاس ایک بہت ہی خوبصورت تتلی آئی تھی لیکن وہ اس پر بیٹھی نہیں، چلی گئی منہ پھلا کر......"

"بیٹا جب یہ پودا بڑا ہو جائے گا اور اس میں بہت سارے پھول کھلیں گے تو بہت ساری تتلیاں آئیں گی۔ خوبصورت رنگ برنگی۔ طرح طرح کے نقش کی......"

وہ سوچ میں کھو گیا۔ "اس پودے کو جلد سے جلد بڑھنا چاہیے۔ روشنی، ہوا، پانی، مٹی سب کچھ موجود ہے تو یہ بڑھتا کیوں نہیں۔ اور میرے اندر جو درخت ہے......

"ابا جی!"

"ہاں بیٹا!" وہ چونک اٹھتا ہے۔ "میں ذرا کچھ سوچ رہا تھا۔"

"ابا جی تم پتہ نہیں کیا سوچ سوچ کر کالے دھس ہوتے جا رہے ہو۔"

وہ ہنستا ہے۔ "بیٹے میں تمہارے گلاب کے پودے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے اندر جو درخت ہے اس کی بھی یہی حالت ہے......"

"تمہارے اندر؟"

وہ چونک اٹھتا ہے۔ "نہیں بیٹا کوئی درخت نہیں، یہ تو صرف ایک خیال ہے۔"

سورج کی روشنی میں کمرہ چمک رہا ہے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ جڑوں کا جال پورے کمرے میں پھیل گیا ہے اور اس کے سارے جسم سے کونپلیں پھوٹ پڑی ہیں۔ دھانی کونپلیں اور ہاتھوں پر گہری سبز پتیاں، جو کھڑکی سے آتی ہوئی ہواؤں میں آہستہ آہستہ جھوم رہی ہیں۔ اس کی آنکھیں پتیوں اور جڑوں کے جال میں کھو سی جاتی ہیں۔ اچانک وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک بہت بلند اور قد آور درخت اس کے جسم سے چھلانگ لگا کر علاحدہ ہو گیا ہے اور اس کی شاخوں نے چمکتے ہوئے سورج کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

"اجی سنتے ہو ـــــ کب تک سوتے رہو گے؟"

بیوی کی آواز سن کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھتا ہے۔

"ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔"

"آرہا ہوں۔ بس ابھی آیا۔"

ناشتے کے دوران اس کی بیوی اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی ہے:

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"دیکھ نہیں رہی ہوں۔ ڈھونڈ رہی ہوں۔"

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"یہی کہ بہت دنوں سے تم کہاں چلے گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب تم اپنے اندر موجود نہیں رہتے۔ بہت پُراسرار ہوتے جا رہے ہو۔ ہر وقت سوچ میں گم۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہیں کسی نے کچھ کر دیا ہے۔"

"مجھے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ میں اس وقت ایک عجیب کشمکش میں ہوں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اپنی بچی نے گلاب کا جو پودا لگایا ہے وہ بڑھ نہیں رہا ہے۔"

"تو کیا ہوا ـــــ یہ تو کوئی اہم بات نہیں۔"

"میں اسے بہت اہم سمجھتا ہوں کہ ایک معصوم بچی کی محنت یوں رائیگاں جا رہی ہے۔ اس پودے کے بارے میں اس نے جتنے خواب دیکھے تھے سب مایوسی میں سما گئے۔ یہ پودا اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اندر سے دُکھی ہو۔"

"تم بہت گہرائی سے سوچ رہے ہو۔"

"نہیں میں آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھی رہا ہوں۔ میں خود ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوں کہ میرے ذہن میں اب صرف تلخیاں ہی تلخیاں ہیں۔ میں نے اپنے فن کے لئے زندگی بھر جو محنت کی ہے کسی کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میرے اندر جو فنکار چھپا بیٹھا ہے وہ بے شک عظیم ہے لیکن اسے سمجھنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔ دنیا صرف تماشے دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہے جس کی وجہ سے اچھے اور سچے فنکار گمنامی میں دفن ہو جاتے ہیں اور تماشے دکھانے والے مستند، مشہور اور معروف۔"

"تو پھر تماشے تم بھی دکھاؤ۔"

گملا نوم کی سیڑھی

"کیا کروں؟ سات سمندر پار چلا جاؤں، ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لوں، کالج کا لیکچرار بن جاؤں، منسٹر یا کروڑپتی ہو جاؤں یا کسی ریڈیو اسٹیشن میں گھس جاؤں؟ میرے نزدیک یہ سب باہر کے جھانکے ہیں۔ یہ درخت دیکھ رہی ہو تم......؟"

"کون سا درخت؟" وہ حیرت سے دیکھتی ہے۔

"ہاں تم اسے نہیں دیکھ سکوگی میرے اندر جو درخت ہے اسے صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کسی بھی زلزلے کا شکار نہ ہو۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تمہارا دماغ........خیر ......میرا خیال ہے تم کسی بڑے فن کار سے مشورہ کرلو۔ ممکن ہے کوئی راستہ مل جائے۔"

"بڑا فن کار صرف سہارا دے سکتا ہے۔"

"تو پھر خود کو دماغ کے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھا دو۔" وہ ہنستی ہے۔ "ابی جناب بڑا فن کار تمہارے اندر کے فن کار کو کچھ بھی تو سکتا ہے۔ سنا ہے کہ کوئی بھی بیل بغیر سہارے کے آگے نہیں بڑھتی۔"

"سہارا؟" وہ چونک اٹھتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ جسم کے اندر بہت ساری پتیاں سمندر کی موجوں کی طرح شور کررہی ہیں اور ایک شاخ اتنی بلند ہو گئی ہے کہ اس کے گرد ستارے چمکنے لگتے ہیں اس کی نظریں آنگن میں کھڑے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑتی ہیں۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دیتا ہے۔

اپنی ساری جڑیں، سارے پتے اور ساری شاخیں سمیٹ کر وہ ایک سلاخ سے گلاب کے پودے کے گرد کی مٹی کھودتا ہے۔

"ابا جی، یہ کیا کر رہے ہو؟"

"بیٹا آج ہم اس پودے کو ڈھیر ساری کھاد دیں گے۔ پھر یہ خوب خوب بڑھے گا۔"

"اچھا!" وہ خوش ہو جاتی ہے

وہ مٹی کھودنے لگتا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ سلاخ کہیں مٹی میں الجھ گئی ہے۔ متحیر ہو کر وہاں کی مٹی ہٹاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ چاروں طرف سے باریک باریک جڑوں کے لچھے آکر پودے کے جسم سے لپٹ گئے ہیں۔

گلابی موسم کی سیڑھی

"ارے ابا جی! یہ اتنی ساری جڑیں کہاں سے آگئیں؟"
وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ـــــ پھر اوپر دیکھتا ہے۔
اوپر برگد کی شاخوں اور پتوں کا ایک مہیب گھنا آسمان۔

آسیبا ـــــ عفریت۔

"بیٹا گلاب کا یہ پودا یہاں زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اسے کوئی چوس رہا ہے" وہ بچہ سے کہتا ہے۔
اسے اکھاڑ کر اب ہم کسی گملے میں لگا دیں گے۔
"کیوں ابا جی؟"
"بیٹا! اس دنیا میں برگد کے درخت بہت ہیں۔ اور ان کے سائے بھی بہت۔ اس پودے کو صرف اپنے سہارے سے آگے بڑھنا ہے۔"
وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جسم نے پتوں کے شور اور جڑوں کی طغیانی سے اپنا رابطہ توڑ لیا ہے۔
وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہا ہے اور ایک شگفتہ، تازہ اور گلابی موسم کی سیڑھی اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

سورج کی روشنی میں کمرہ چمک رہا ہے۔
کھڑکی کے شیشوں سے باہر وہ دیکھتا ہے کہ گملے میں لگے ہوئے گلاب کے مختصر پودے میں ان گنت پھول کھلے ہوئے ہیں جن پر طرح طرح کے نقش کی رنگ برنگی تتلیاں رقص کر رہی ہیں اور اس کو بھی اس منظر کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔

چنگاریوں کے جلوس میں مسحور گھوڑا

پارک میں اس نے سب سے خوبصورت پھول کا انتخاب کیا اور اسے توڑ لیا۔
پھر ایک ایک کر کے اس کی تمام پنکھڑیاں نوچ نوچ کر پھینک دیں۔
گیٹ سے باہر ہوا تو قریب ہی ایک بچہ پتنگ اڑا رہا تھا۔
اس نے لپک کر اس کی پتنگ کی ڈور توڑ دی۔
سامنے سے ایک لڑکی سائیکل پر چلی آ رہی تھی۔
اس نے دھکا مار کر اسے نیچے گرا دیا۔
اور جب آگے چلا تو اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

چوراہے پر پہونچ کر وہ ذرا دیر رکا۔ ایک سمت سے ایک براؤن کار آ رہی تھی، وہ قریب آئی تو وہ اس کے سامنے سے نکل گیا۔ ایک پُرشور دھچکے کے ساتھ کار رک گئی۔ کچھ لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ ٹریفک کانسٹبل نے سیٹی بجائی لیکن اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

"ابھی مر جاتا۔" پیچھے سے آواز آئی۔

وہ ہنسا ـــــــ سامنے سے دو لڑکیاں آ رہی تھیں۔ وہ ان کے بیچ سے نکل گیا۔

"پاگل ہے کیا؟" ایک لڑکی نے دوسری لڑکی سے کہا۔

"نہیں! ـــــــ اندھا ہے شاید۔"

وہ کھسیا گیا۔ آنکھوں میں برق سی چمک اٹھی۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دور تک

چنگاریوں کے ہجوم میں سمو گھوڑا

...... صف بہ صف چنگاریاں۔ اس نے آگے دیکھا۔ آگے بھی چنگاریاں...... اس نے پیچھے دیکھا...... پیچھے بھی چنگاریاں۔

"ارے شہر کہاں چلا گیا" وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "ابھی ابھی تو یہیں تھا" اچانک وہ کسی سے ٹکرا گیا۔ سامنے دیکھا۔ دو خوبصورت آنکھیں تھیں۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔ آنکھیں مسکرائیں اور چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر ادھر ہی دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آس پاس دیکھا تو شہر موجود تھا۔

"ممکن ہے یہ شہر مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔" وہ غرّایا۔ "میں ایک فتنہ ہوں اس طلسم خانہ کا۔ ایک دن اس شہر کو ساکت کر دوں گا۔"

اس نے فٹ پاتھ پر پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور اسے پوری قوت سے ایک طرف پھینکا۔ پتھر پولس چوکی میں سب انسپکٹر کے ٹیبل پر گرا۔

انسپکٹر اچھل پڑا۔

لاٹھیاں حرکت میں آ گئیں۔ آس پاس بھگدڑ مچ گئی۔ کئی لوگ گرفتار کر لئے گئے۔

وہ قریب کی ایک گلی میں گھس گیا اور تیز تیز چلتا ہوا ایک پُر شور چوراہے پر نکل آیا۔ سامنے ایک بارونق ریسٹورنٹ تھا۔ وہ اندر جا کر بیٹھ گیا۔ ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا۔

چائے آئی ــــــ فوراً ختم ہو گئی۔

ایک چائے اور آئی۔ وہ بھی ختم ہو گئی۔

پھر وہ قریب بیٹھے ہوئے ایک ایسے شخص کی طرف دیکھنے لگا جو نہایت قیمتی سوٹ میں تھا۔ اٹھ کر اس کے قریب گیا۔

"آج کی شام کتنی سہانی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شام! کیا مطلب؟" اس شخص نے حیرت سے کہا۔ "ابھی تو دوپہر ہے۔"

"دوپہر...... اچھا تو دوپہر ہی سہی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کا یہ سوٹ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے اسے پھاڑ ڈالوں۔"

"جی؟"

"جی ہاں! یہ میرے کپڑوں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ میں اسے پھاڑ ڈالوں گا۔"

آواز سن کر دو ویٹر قریب آئے۔ اور.......

اسے فٹ پاتھ پر اتار کر واپس ہو گئے۔

وہ کھسیا گیا اس نے پتھر تلاش کیا مگر پتھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ پتھر کی تلاش میں بہت دور تک چلا گیا۔

"عجیب شہر ہے......کہ وقت پڑے تو پتھر بھی نہیں ملتے۔"

اس نے آنکھ اٹھا کر ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"اوہ! میں ان سمندری سبز آنکھوں سے کتنا قریب آ گیا ہوں جن کی گہرائیوں میں طوفان قید ہیں۔"

وہ ایک ویران سی گلی میں ایک بند دروازے پر رک گیا۔ دستک دی۔ ——— دروازہ کھلا۔ سمندری سبز آنکھیں سامنے تھیں۔

"اندر آ جاؤ۔"

وہ اندر گیا ——— دروازہ بند ہو گیا۔

سمندری سبز آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ وہ خاموش ان آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظر ہونٹوں پر گئی۔ ہونٹ بھی چمک رہے تھے۔

"بہت دنوں کے بعد یاد کیا۔ کہاں رہے اتنے دن؟"

اس کی نظر گریبان پر گئی۔ گریبان بھی چمک رہا تھا۔

"آج تم بہت چمک رہی ہو ——— میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ تو رہے ہو۔" سمندری سبز آنکھوں میں شفق سی اتر آئی۔

"میں اس شفق کو اور گہری کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون سی شفق؟"

"سامنے تو ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ شفق پورے کمرے میں گردش کر رہی ہے۔ خیر چھوڑو .... آج کی دوپہر کتنی سہانی ہے۔"

"دوپہر؟" سمندری سبز آنکھیں حیرت میں چونک اٹھیں۔ "اب تو شام ہو رہی ہے۔"

"شام؟...... اچھا تو شام ہی سہی۔ میں ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ دنیا واقعی اجنبی ہے اور کیا میں یہاں قید ہوں۔ اگر میں اس کمرے کے سارے فرنیچر توڑ دوں تو کیا تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ گی۔"

"تم نے کبھی مجھے خوش بھی کرنے کے بارے میں سوچا ہے؟"

"میرے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ اگر میں ذرا دیر بھی سوچنے کے لئے بیٹھ جاؤں تو اس شہر کی ساری سرگرمی اور حرکت بند ہو جائے گی۔ پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔"

"لیکن ابھی تو تم اپنے آپ کو قیدی ظاہر کر رہے تھے۔ خیر.....؟" سمندری سبز آنکھیں اور قریب آکر مسکرائیں۔ "تم نے مجھ سے شادی کا جو وعدہ کیا تھا' بھول گئے؟"

"شادی؟ یہ تو مس لیزا کی بلی کا نام ہے؟"

"تم ہوش میں ہو کہ نہیں؟"

"ہاں میں ہوش میں ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں سے قریب آتے جا رہے ہیں اس حالت میں مجھے خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ تمہارا جسم ریشم کی طرح گرم ہوتا جا رہا ہے......"

"ریشم گرم نہیں ہوتا...... ہاں ایک بات یاد آئی۔ صوفیہ کہہ رہی تھی کہ پرسوں تم نے اسے دھکا مار کر کیچڑ میں گرا دیا تھا۔ یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

"وہ بہت صاف کپڑوں میں تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیچڑ میں گر کر وہ کیسی لگتی ہے تو میں نے دیکھا جیسے کنول کا پھول۔"

اچانک کمرے میں پھولوں کی ایک باڑھ آ گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا پھولوں کے ڈھیر کے ڈھیر اور ان کے درمیان گھورتی ہوئی چنگاریاں۔

"اوہ۔ یہ چنگاریاں یہاں بھی آ گئیں۔"

اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور سمندری سبز آنکھوں کا لباس تار تار ہو کر ادھر ادھر بکھرنے لگا۔

"یہ کیا کررہے ہو ؟"

"شادی"

پھر اس نے قریب رکھا ہوا شیشے کا گلدان اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں لیکن اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

پُر شور چوراہے پر ایک اندھا فقیر ہاتھ میں کشکول لئے اور زبان کو سہرا باندھ کر صدائیں لگا رہا تھا۔

"اے صاحبِ آنکھ والو! اے صاحبِ ایمان والو..... مجھ قیدِ یتیم پر، مجھ دیدۂ نابینا پر ترس کھاؤ ـــــ اللہ کے نام پر..... کاسہ میں ڈال دو....."

فقیر کے قریب رک کر اس نے ادھر ادھر پڑے ہوئے چند پتھر اٹھا کر اس کے کاسے میں ڈال دئے۔

فقیر نے دعائیں دیں۔

"اللہ تمہیں ایک کا ستر دے۔"

اس نے گھور کر فقیر کو دیکھا مگر وہ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنی صداؤں میں مست تھا۔ وہ کھسیا کر آگے بڑھ گیا۔ سامنے سے عورتوں کا ایک احتجاجی جلوس نعرے لگاتا ہوا بڑے جوش میں چلا آرہا تھا۔ فٹ پاتھ پر لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ جلوس سامنے سے گذرنے لگا۔ وہ کچھ لمحے ادھر دیکھتا رہا پھر اچانک جلوس میں گھس گیا اور چند عورتوں کو دھکا دیکر اس پار چلا گیا۔ عورتیں چلائیں۔ جلوس رک گیا۔ دور کھڑے ہوئے سپاہیوں نے ڈنڈا ہوا میں لہرایا۔ اس نے محسوس کیا کہ سب عورتیں اسے گھور رہی ہیں۔ وہ لپک کر ایک پتلی سی گلی میں گھس گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ کچھ دور چل کر اس نے پیچھے دیکھا۔ گلی سنسان تھی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں آنکھیں اسے گھور رہی ہیں اور تمام آنکھیں خنجروں کی طرح چمکدار ہیں۔

اس نے غصے میں ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے اُدھر پھینکا۔ پتھر ایک بلڈنگ کی تیسرے منزلے کی کھڑکی کے پٹ ہٹا کر اندر چلا گیا۔

"کون ہے بے ؟" ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سر سہلاتا ہوا کھڑکی میں سے جھانکا۔

"نیچے آ !" اسے دیکھ کر اس نے دوسرا پتھر اٹھایا۔

کھڑکی فوراً بند ہو گئی۔

وہ پتھر ایک طرف پھینک کر ذرا آگے چلا۔ آگے ایک درخت سے ایک حیران و پریشان گائے بندھی ہوئی تھی رسی توڑنے کی دھن میں تھی۔ اس نے گائے کا رسّی کھول دی۔ گائے خوشی میں ایک سمت بھاگی۔

"جا تو بھی جلوس میں شامل ہو جا" وہ زور سے چیخا۔

تیسرے منزلے کی کھڑکی پھر کھلی ——— وہی آدمی پھر نظر آیا مگر نظروں چار ہوتے ہی کھڑکی دھڑ سے بند ہو گئی۔

وہ دونوں جیب میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے چلنے لگا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک پینٹر سیڑھی لگائے دیوار پینٹ کر رہا تھا اس نے چلتے چلتے سیڑھی کو ذرا سی ٹھوکر لگائی۔ پینٹر "ارے ..... ارے" کرتا ہوا سیڑھی سمیت نیچے آ گرا۔ رنگ کا ڈبہ اس کے اوپر الٹ گیا اور وہ خود پینٹ ہو گیا۔ لوگ وہاں جمع ہونے لگے۔

وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلا تو اس کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔

سورج سر پر تھا۔ پل پر کھڑے ہو کر اس نے نیچے ندی کی طرف دیکھا۔ صاف و شفاف چمکتا ہوا پانی۔ ندی کے کنارے کافی شور تھا۔ بہت سارے بچے نہا رہے تھے۔ انھیں نہاتے اور ڈبکیاں لگاتے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پل سے اتر کر نیچے گیا۔ کچھ دیر ٹہل ٹہل کر بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر نہایت تیزی سے ان کے کپڑے اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکنے لگا۔ بچوں نے شور مچایا' پھر رونے لگے۔ انھیں روتا دیکھ کر وہ ہنستا ہوا وہاں سے چل پڑا۔

بازار قریب ہی تھا۔ وہاں پہونچ کر اس نے ایک ریوڑی والے کا تھال اوندھا کر دیا۔ ایک جگہ کھڑی ہوئی بہت ڈھیر سائکلیں گرا دیں اور کئی پتھر اٹھا کر احتیاطاً جیب میں رکھ لئے۔ چلتے چلتے ایک سبزی ترکاری والے کی دوکان سے ایک کریلا اٹھا لیا۔

اچانک ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"ارے صاحب آنکھ والو...... اے صاحب ایمان والو...... مجھ غریب یتیم پر......

مجھ دیدہ نابینا پر ترس کھاؤ......"

اس دیکھا' ایک طرف وہی اندھا فقیر کھڑا صدائیں لگا رہا تھا۔

وہ اس کے قریب گیا اور اس نے ہاتھ میں لیا ہوا کریلا اس کے کاسے میں ڈال دیا۔ فقیر نے

کاسے میں ہاتھ ڈال کر کریلے کو ٹٹولا۔

"کیا چیز ہے یہ ؟ کھردری سی! لگتا ہے کریلا ہے۔ چھی! ـــــ جس چیز سے فقیر چڑتا ہے

...... ارے او صاحب خیرات دینے والے۔ تجھے شرم نہیں آتی......"

وہ غصہ میں فقیر کو دیکھنے لگا۔ فقیر نے کاسے میں سے کریلا نکال کر نفرت سے پھینک دیا۔

" چھی چھی۔ اندھے سے مذاق کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی دینے کی چیز ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ مٹھائی

کی دوکان کے پاس کھڑا ہوں۔ ارے دینا ہی تھا تو کچھ اور دیتے۔ خیر۔ اللہ تمہیں ایک کے بدلے میں

ستر دے۔"

غصہ میں اس کی آنکھیں تن گئیں۔ چاروں طرف چنگاریاں ناچنے لگیں اور جیب کا پتھر ہاتھ

میں آ گیا لیکن سامنے سے آتے ہوئے پولس کو دیکھ کر اس نے اپنا رخ بدل دیا۔

ایک خوبصورت عمارت کے احاطہ میں رنگین روشنیاں' موسیقی' سلیقے سے آراستہ میز

اور کرسیاں' قیمتی لباس اور خوبصورت چہرے دیکھ کر اس کے قدم خود بخود اندر پہونچ گئے۔

" شاید یہاں کوئی پارٹی ہے"

تمام چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ایک میز کی طرف بڑھا ـــــ ایک خوش پوش مرد ایک

خوبصورت لڑکی اور خالی دو کرسیاں...... وہ نہایت باوقار انداز میں ایک کرسی کھینچ کر اُنکے

درمیان بیٹھ گیا۔ چند لمحے سر گھما گھما کر ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر اس نے مسکرا کر مرد سے کہا۔

" آج کی شام کتنی سہانی ہے"

"شام ؟ ـــــ" مرد نے اسے سر سے پاؤں تک حیرت سے دیکھا۔ "اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔"

"اچھا ـــــ میں سمجھا کر شام ہے۔" پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "آج آپ بہت چمک رہی ہیں۔"

"کیا مطلب ؟" لڑکی کے چہرے پر غصہ ابھر آیا۔

"مطلب یہ کہ اس لباس میں آپ بالکل بجلی لگ رہی ہیں اور آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کی وہ حسین شام یاد آرہی ہے جب ہم اجنبی نہیں تھے۔"

"کیا بک رہے ہو ؟" مرد نے غصہ میں اس کا گریبان پکڑ لیا۔

شور مچ گیا۔ لوگ جمع ہونے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں اسے احاطے سے باہر کر دیا گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑنے لگیں۔ باہر آکر اس نے احاطے میں دو تین پتھر پھینکے اور چیخا۔

"میرے ساتھ ایسا سلوک۔ جانتے نہیں یہ شہر میرے دم سے ہے۔ یہاں ساری حرکت، توانائی اور سرگرمی مجھ سے ہے۔"

چلتے چلتے اس نے ٹیوب لائٹ کو نشانہ بنایا اور دوسرا ٹیوب لائٹ تلاش کرتے کافی آگے نکل گیا۔ ریلوے پلیٹ فارم تھوڑے فاصلے پر تھا۔ لوہے کے جنگلے سے کود کر وہ ریلوے لائین پار کرنے لگا۔ اچانک پلیٹ فارم کی طرف شور بلند ہوا۔ اندھیروں اور اجالوں کی پرچھائیوں کے درمیان اس نے دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ میں کچھ لئے بھاگا آرہا ہے اور پیچھے ایک دوسرا آدمی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

وہ اندھیرے میں ساکت کھڑا ہوگیا۔

"پکڑو پکڑو !" پیچھے والا آدمی چیخ رہا تھا۔ "یہ میرا سوٹ کیس لے کر بھاگ رہا ہے چور چور ـــــ"

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے ادھر دیکھتا رہا۔

سوٹ کیس لیکر بھاگنے والا آدمی اس کے قریب سے نکل کر جنگلے پر چڑھنے لگا اور پیچھے والا آدمی جب نہایت تیزی سے قریب آیا تو اس نے اچھل کر اسے نہایت مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"ارے ارے مجھے چھوڑو۔ وہ میرا سوٹ کیس لے کر بھاگ رہا ہے ۔"

لیکن اس نے اسے اور مضبوطی سے جکڑ لیا۔ پہلا آدمی جنگلے سے کود کر فرار ہو گیا۔ پلیٹ فارم کی طرف سے کچھ لوگ اور دوڑتے ہوئے آئے اور پھر اس پر چاروں طرف سے گھونسے برس پڑے۔ ہوا میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔

کچھ دیر بعد وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ ڈھیر سارے پتھر اٹھا کر جیبوں میں بھر لئے اور کچھ پتھر ہاتھوں میں لے کر چلا۔ آگے پیچھے چنگاریوں کا جلوس بھی چلا۔

چنگاریوں کے جلوس میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا کہ وہ ایک دراز قد سیاہ عربی گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے ہاتھ میں اصفہانی تلوار اور پشت پر مرا قش کی ڈھال ہے۔ پیچھے دور تک اس کا لشکر جرار ہے جہاں تلواروں کے جنگل میں بجلیاں کوندرہی ہیں۔

اس نے اپنی بائیں سمت چلتے ہوئے سپہ سالار سے کہا

"آج اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا ہے۔"

سپہ سالار نے سر خم کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا اور خندق میں گر گیا۔

"ارے کہاں گئے تم ؟" اس نے آواز دی۔

"میں خندق میں ہوں۔ میری ٹانگ ایک مگرمچھ نے پکڑ لی ہے۔"

اس نے جلدی سے پیچھے دیکھا۔ لشکر غائب تھا اور صرف چنگاریوں کا جلوس متحرک تھا۔ اس نے چنگاریوں سے کہا۔ "آؤ چنگاریو آؤ۔ میرے ساتھ چلو!"

ایک کٹ وہ روڈ پر آ کر اس نے پہلا پتھر اٹھا کر ایک پٹرول پمپ پر پھینکا۔ دوسرا پتھر اڑوس پاس کھڑی ہوئی کاروں پر۔ شور بلند ہوا تو وہ بھاگ کر اندھیری گلی میں گھس گیا اور اندر ہی اندر چلتا ہوا دوسرے روڈ پر نکل آیا۔ سامنے ایک جگمگ کرتا ہوٹل تھا اس نے غصہ میں اس پر بھی پتھر اڑا دیا ——— بہت سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بہت تیز سیاہ عربی گھوڑے کی طرح بھاگا۔ سامنے سے ہارن دیتی ایک ٹیکسی آ رہی تھی اس نے ایک پتھر ٹیکسی کی طرف بھی پھینکا۔ ٹیکسی فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک سُرمے والے کی دوکان سے ٹکرا گئی۔

"لگا لے تو بھی سُرمہ جانِ من ۔" اس نے ٹیکسی سے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے سے

چنتا پاؤں کے حلقوں میں سوگھڑا

آتے ہوئے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور شور میں بھی اضافہ ہو گیا تھا وہ اور تیز دوڑنے لگا۔ سامنے سے پولس جیپ سائرن بجاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسی کے لئے آ رہی ہے۔ ایک لمحہ رک کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک سمت گھوم کر ایک تاریک پارک میں گھس گیا۔ کچھ دیر وہیں چھپا رہا پھر احاطے سے کود کر ایک گلی میں آ گیا۔

"آج کی رات کتنی سہانی ہے" ایک ٹیوب لائٹ کے نیچے ٹھہر کر اس نے پھر ڈھیر سارے پتھر جمع کئے۔ پہلے تو ٹیوب لائٹ پر ایک پتھر پڑا، پھر آس پاس کے گھروں کی طرف کئی پتھر لپکے۔ گھروں میں روشنیاں ہونے لگیں اور بہت سارے لوگ نکل کر اس کی طرف دوڑے۔

"پکڑو! پکڑو!!"

وہ پھر بھاگا اور کئی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں لہراتا ہوا ایک سنسان چوراہے پر آ گیا۔ محسوس ہوا کہ تعاقب کرنے والوں کی آوازیں کئی طرف سے آ رہی ہیں اور کئی طرف پولس جیپ کے سائرن غرّا رہے ہیں۔ سامنے ویران گلی تھی۔

"سمندری سبز آنکھیں" اس نے خوشی میں قہقہہ لگایا۔ "اب مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

دروازے پر جا کر اس نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ وہ جلدی سے اندر ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" سمندری سبز آنکھوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "اتنے ہانپ کیوں رہے ہو؟"

"میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ مجھے تم سے فوراً شادی کرنی ہے۔"

"شادی؟ ___ اتنی رات میں؟"

"ہاں بہت ڈھیر لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"ضرور تم نے کوئی گڑبڑی کی ہوگی" سمندری سبز آنکھیں مسکرائیں۔

"ہاں، آج تو پورے شہر کو حرکت میں لے آیا۔ سب طرف ہلچل مچ گئی ہے۔ لوگ مجھے خزانے کی طرح تلاش کر رہے ہیں" وہ صوفے پر نیم دراز ہو کر سمندری سبز آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ "آج میں بہت تسکین محسوس کر رہا ہوں لگتا ہے کہ میں بالکل مکمل ہو کر سب طرف چھا گیا ہوں۔ سب مجھے ڈھونڈ رہے ہیں لیکن وہ خود کھو جائیں گے۔ آج کی رات .... کتنی سہانی ہے؟"

اچانک اس نے محسوس کیا کہ سمندر کی سبز آنکھیں آہستہ آہستہ چنگاریوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ وہ مکمل طور پر چنگاریوں کا ہیولا بن گئی ہیں۔

اس نے گھبرا کر اپنے آپ کو دیکھا، لیکن دیکھ نہیں سکا۔

صرف نے پر اس کی بجائے چنگاریوں کا ایک جلوس نم دراز تھا۔

میری جیب میں ہیرا ہے

اب میں محمل اور اسرارِ کائنات۔
اب میری آنکھ ہے اور دنیائے طلسمات۔
تجربات...... مشاہدات اور محور پر تنہا میری اپنی ذات ــــ

یک بہ یک جیسے پوری دنیا کا موسم بدل گیا ہے۔ اب ایسا موسم ہے جس میں جھوٹ کے سارے ملبوسات راکھ بن کر اڑ گئے ہیں۔ سب کے چہروں سے رنگین چشمے اور کالی نقابیں (نخرے والیاں) اتر گئی ہیں۔ اب کوئی چہرہ تہہ دار نہیں۔ ساری گھوڑیاں (اداکاریاں) خوفزدہ ہو کر بھاگ گئی ہیں۔
اب ہر شئے اپنے تمام تکلفات سے باہر اپنے اصل روپ میں ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا قد پہلے سے ڈیڑھ درجہ بلند ہو گیا ہے۔ میں دنیا کا سب سے مشہور آدمی بن گیا ہوں کیوں کہ اب میری جیب میں ایک اتنا بڑا ہیرا ہے کہ جس میں میں پوری دنیا دیکھ سکتا ہوں اور جب سے یہ ہیرا میری جیب میں وارد ہوا ہے۔ یہ خوبصورت تقاضہ (دنیا)، اتنی چھوٹی اور ہلکی ہو گئی ہے کہ میں اسے با آسانی دوسری جیب میں رکھ سکتا ہوں۔
میں جس ملک میں بھی داخل ہوتا ہوں وہاں کے اخبارات اور ریڈیو اپنی شاہ سرخیوں اور نشریات کے تاج و تخت میرے نام محفوظ کر دیتے ہیں۔
'دنیا کا سب سے بڑا اور بیش قیمت ہیرا ہماری سرزمین پر......'

میرا جیب میں ہیرا ہے۔

یہ انگلینڈ، ہالینڈ، ایران، جاپان، کوریا، جرمنی، میکسیکو، اسپین، فاک لینڈ اور ہنگری، ڈنمارک وغیرہ تمام ممالک اور ہیرو، قلوپطرہ، ساخانا، انڈیمان وغیرہ تمام جزائر میرے سامنے چھوٹی موتی کی طرح سمٹ سمٹا کر صرف ایک شہر کی فصیلوں کے اندر آن بسے ہیں اور یہ ہیرا اس شہر کا ایک تیز چمکتا ہوا سورج۔ جس کے آگے علم و فن، قانون و مذاہب کے تمام جھاڑ کے جیسے ماند پڑ گئے ہیں۔ اب میرے گرد حسّاس انسانوں کا طوفان ابر و باد ہے ــــ اور کروڑوں آنکھوں کا ایک ہجوم ہے۔ جو میری جیب کو دیکھ رہا ہے۔

میں کتنا مقبول اور ہر دلعزیز ہو گیا ہوں۔ اب کوئی بھی مجھ سے منحرف نہیں۔ سب میرے مدّاح ہیں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں، جس راستے سے بھی گذرتا ہوں ایک ہجوم لگ جاتا ہے۔ مجھے دیکھنے کے لئے ــــ میرے قریب آنے کے لئے ــــ مجھ سے ملنے کے لئے سب بے قرار رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دور کی امامت میری جیب میں ہے۔

میرا لمحہ لمحہ بہت قیمتی اور مصروف ہے کیونکہ تہ بہ تہ تماشے میرے گرد طلائی جالے بن رہے ہیں۔ اور بے شمار آنکھیں ان جالوں میں الجھی ہوئی گل نرگس کی طرح حیران حیران سی مجھے تک رہی ہیں۔ ان آنکھوں نے اور ان چہروں نے مجھے حد درجہ دیدہ ور اور حسّاس بنا دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر آنکھ کی گہرائی میں ایک سمندر ہے اور ہر سمندر کی تہ میں اس چمکتے ہوئے ہیرے کا عکس۔

میں مسکراتا ہوں۔

میری مسکراہٹ میری جیب میں پڑے ہوئے ہیرے کی طرح تراشیدہ ہے (اسلئے زیادہ چمکدار ہے۔) کوئی نہیں جانتا کہ ہیرا قیمتی ہے یا مسکراہٹ۔

میری میز پر وزیٹنگ کارڈ کی فوج صف آرا ہو رہی ہے۔ عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، نارویجن، ڈچ اور مختلف زبانوں کے الفاظ متحرک ہیں۔ یہ ٹیبل ایک دربار کی حیثیت رکھتا ہے جہاں سارے نام...... عہدے اور ڈگریوں سے سولہ سنگھار کر کے میرا دیدار کرتے ہیں۔

میں ٹیبل سے ہٹ کر ڈرائنگ روم میں آتا ہوں۔

صوفوں سے لگے ہوئے لاتعداد چہروں کی قطاریں متحد اور متوجہ ہو جاتی ہیں اور تمام آنکھیں ملکۂ عالم (میری جیب) پر مرکوز ہو جاتی ہیں جہاں ہیرا محفوظ ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہر چہرے سے

ادب و احترام کی تحریریں ہویدا ہو رہی ہیں۔ آس پاس کے اور سات سمندر پار کے ان مہذب چہروں کو دیکھ کر خود میرے اندر خوشی کی لہریں شور مچاتی ہیں۔ لگتا ہے ڈرائنگ روم میں پوری دنیا جمع ہو گئی ہے میں اپنی جیب دیکھ کر مسکراتا ہوں۔

میری سکریٹری یکے بعد دیگرے سب کا تعارف کراتے ہیں۔

میں شاہانہ انداز میں ایک ایک قدم آگے بڑھاتا ہوں۔

یہ بڑے بڑے تاجر، صنعت کار، وزراء اور سیاست داں وغیرہ سب مجھ سے مرعوب ہیں۔ میں یقیناً دنیا کا سب سے اہم اور خوش قسمت انسان ہوں اور اس مقام پر ہوں جہاں مجھ سے ملنے والے کچھ لینے کی بجائے مجھ کو کچھ پیش کرنے آتے ہیں۔ تحفے تحائف، اور طرح طرح کے عہدے اور اعزازات۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ دنیا کی کون کون سی صنعت اور بزنس میں مجھے شریک کیا گیا ہے۔ یہ صدارت ..... یہ افتتاح ..... یہ استقبال ..... اے مالکِ عالم، تیرا شکریہ۔

وہ سیدھی میری خواب گاہ میں داخل ہوتی ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں۔ ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر قالین پر گر جاتا ہے۔ وہ مسکرا رہی ہے۔ میں جیسے گرم گرم ریت میں دھنستا جا رہا ہوں۔ میری بہت بڑی شکست میرے سامنے ہے۔ وہ اس وقت سُرخ لباس میں ہے۔ اس کے ہونٹوں پر وہی تانگی ہے جو پہلے کبھی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اسے حاصل کرنے کے لئے میں نے زندگی کا سب سے بڑا جہاد کیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کے لئے میرے دل میں خواہشوں کا کتنا زبردست طوفان تھا۔

یونیورسٹی کے احاطے میں ایک دن میں نے اس سے کہا تھا۔

"میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ جی چاہتا ہے تم سے کئی سو شادیاں کر ڈالوں۔"

لیکن اس نے ایک فلک بوس عمارت سے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور آج جبکہ ہر فلک بوس عمارت میرے قدموں کے نیچے ہے۔ یہ میرے پاس کس اعتماد اور تمکنت سے آئی ہے جیسے مجھ سے کئی سو شادیاں کر ڈالے گی۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اب مجھ پر چاروں طرف سے خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ لپکتے ہیں۔

"تو لو ..... آج میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔"

"شکریہ ــــــ لیکن اب میرے دل میں کوئی خواہش نہیں۔"

"تمہاری جیب میں کیا ہے؟"

"پتھر ـــــ فاتح عالم"

"یاد ہے ایک دن تم نے مجھے ملکۂ عالم کہا تھا......"

"یاد ہے۔ لیکن یہ خطاب اب میں اپنی جیب کو دے چکا ہوں"

"پھر اب میں کیا کروں؟"

"دروازہ کھلا ہے"

اور اچانک تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔

میں اور بھی بہت کچھ دیکھنے اور محسوس کرنے لگا ہوں۔ بے شک میں بے انتہا ذہین اور حساس ہو گیا ہوں۔ میری آنکھ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ میں زمین کے اندر اور سات سمندروں کے پار بھی دیکھ سکتا ہوں۔ میں انسان اور ذرّہ ذرّہ کے اندر سانس لیتی ہوئی کائنات کو مکمل طور پر سمجھ چکا ہوں۔ انسان کو جس روشنی کی تلاش ہے وہ اس ہیرے میں کہیں چھپی بیٹھی ہے۔

ایک سیاہ عکس کھڑکی کے ذریعے "دھم" سے کود کر اندر آجاتا ہے۔

سبز مدھم روشنی میں وہ صاف دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے کاندھے پر شاید ایک جھولا لٹکا ہوا ہے۔ اور ہاتھ میں بجھی ہوئی ٹارچ ہے۔ کچھ دیر ساکت کھڑے رہ کر وہ ادھر ادھر بہت احتیاط سے دیکھتا ہے پھر ٹارچ جلانے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام ہو جاتا ہے۔

"کم بخت دھوکہ دے گئی......" وہ بڑبڑاتا ہے۔

میں زور سے کہتا ہوں۔ "کون ہو تم؟"

"اور تم کون ہو؟" وہ بے ساختہ پوچھتا ہے۔ "کہاں چھپے بیٹھے ہو؟"

"میں یہاں صوفے پر ہوں' مگر تم ہو کون؟"

"مجھے پہچانا نہیں کیا؟ میں ہیروں کا بہت مشہور چور ہوں۔ لیکن مجھ سے پہلے تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ ویسے مجھے پہلے سے ہی خطرہ تھا کہ یہاں پہنچنے پر کسی دن کسی ہم پیشہ سے ملاقات ضرور ہو جائے گی لیکن یاد رکھو! اس ہیرے پر صرف میرا حق ہے"

"تم ہیرا چرانے آئے ہو؟"

"ہاں"

"مگر جاؤ گے کیسے۔ وہ تو ہر وقت جیب میں رہتا ہے"

"کہیں بھی رہے۔ آج وہ میرے ہاتھ آجائے گا"

"تمہارے ہاتھ میں تو تمہاری ماچس بھی پکڑنے سے بھی محروم ہو گئی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔"

"تمہارے جھولے میں کیا ہے؟"

"بہت کچھ ہے"

"شاید عقل بھی تم اسی میں رکھتے ہو"

"خاموش! مجھے لگ رہا ہے کہ تم باتوں میں میرا وقت برباد کر رہے ہو۔ بہتر ہے کہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جاؤ"

"اور اگر نہ جاؤں تو؟"

"تو میں شور مچا دوں گا اور تم پکڑے جاؤ گے"

"تو ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں" میں صوفے سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔

"اُدھر سے نہیں۔ اِدھر سے جاؤ۔ یہ کھڑکی بہت محفوظ راستہ ہے"

"ٹھیک ہے" میں آگے بڑھ کر روشنی گل کر دیتا ہوں۔

وہ گھبرا کر ایک نظر مجھ کو دیکھتا ہے۔

اور چھلانگ لگا کر کھڑکی میں سے غائب ہو جاتا ہے۔

میں کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھتا ہوں۔ باہر گہرا اندھیرا ہے مگر اس ہیرے کی چمک میں ایک ایسا سحر ہے جس نے چاروں سمتوں کو باندھ لیا ہے۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔

میرے گرد و پیش جو لوگ سانس لے رہے ہیں وہ اُن گھوڑوں سے مشابہ ہیں جن کی گردن زین کسی ہوئی ہے اور سامنے بحرِ ظلمات ہے۔ یہ سب میری قربت پر فخر محسوس کرتے ہیں میرے ہر حکم پر اثبات میں جنبش دیتے ہیں۔ مجھ سے ملنے جتنے لوگ بھی آتے ہیں میں سب کو پہچانتا ہوں۔ یہ سلام و نیاز، یہ تعریفوں کے طومار، یہ ہوش رُبا ادائیں، یہ آستینوں سے ٹپکتا ہوا عطر!

میرا خیال ہے کہ لوگ خطرے کے لئے شوقین ہوتے ہیں کہ اپنی بجلیوں کو بھی لگا دیتے ہیں۔
سب کو جانتا ہوں میں۔ روشن ضمیری کی حد شاید یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس ہیرے نے
میرے اندر ایک قدر بھر دیا ہے اور رقاصہ (دنیا) میرے سامنے ناچ رہی ہے۔ یہ رقص میں بھی دیکھ
رہا ہوں اور میرے قریب رہنے والے بھی۔ میرے دم ساز...... میرے محافظ..... میرے رفیق
...... یہ سب میرے جسم کے مختلف حصے ہیں۔ تیز طرار جنگلی گھوڑوں کی طرح، مجھے ناز ہے ان پر۔
یہ سب کتنے حساس اور ہوشمند ہیں۔ میری قمیص کی ہر شکن پر کتنی عالمانہ گفتگو کرتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے
کہ میری جیب میں جو ہیرا ہے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کرتے لیکن اس کی طرف سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ میں
انھیں اپنا بہترین محافظ سمجھتا ہوں۔

میری آنکھیں ایک سرور کی کیفیت میں بند ہونے لگتی ہیں۔

اور اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ اب سے بہت پہلے میں خود بھی کسی کا محافظ تھا۔ اور محسوس ہوتا
ہے کہ موسم بدل رہا ہے، منظر بدل رہا ہے۔

قالین، جھومر، الماریاں اور تخت وغیرہ سب سرک رہے ہیں۔

(میں ماضی کی طرف مراجعت کر رہا ہوں۔)

...... ہاں یہ میں ہوں۔ ایک انتہائی معمولی آدمی کہ میری جیب میں ماچس کی ڈبیہ بھی نہیں۔ میرے
جسم پر بوسیدہ کپڑے ہیں اور میں پوری دنیا میں تنہا ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، مجھے کوئی نہیں جانتا۔
میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ (ماضی کا منظر غائب ہو جاتا ہے۔)

قالین، جھومر اور تخت وغیرہ سب موجود و سلامت ہیں۔ کوٹھی کے سامنے چمکتی ہوئی کاروں کی رنگین
کہکشاں متحرک ہے۔ نیبل پر رونق صف آرا ہیں۔ فون کی گھنٹیاں گنگنا رہی ہیں۔ خوبصورت لڑکیوں
کی آنکھوں میں انتظار کے ستارے چمک رہے ہیں۔

بے شک میں خوش قسمت انسان ہوں۔ کل اور آج میں کتنا فرق ہے۔ کل مجھے کوئی نہیں جانتا
تھا اور آج ایک پتھر نے پوری دنیا کو تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ہیرا بہت کچھ ہے۔ ایک بہت بڑی طاقت،
ایک مقدّر..... بے حد عظیم...... بے حد مہربان

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرتا ہے۔

اگر یہ سارا چکا چوند اس ہیرے کے باعث ہے تو کیا میری اپنی ذات کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ اگر میں اس ہیرے کو اپنی ذات سے الگ کر دوں تو کیا یہ سب کچھ موجود رہے گا؟

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسک گئی ہو ——

اُف! میرے اندر تشکیک کے زہر کا یہ سوتا کہاں سے پھوٹ پڑا۔ میں آفتاب چین کیوں ہو گیا ہوں۔ ماضی بار بار سامنے ایستادہ کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے ماضی سے کیا غرض۔

میں خود کو تسلی دیتا ہوں۔ اس دور کی امامت تو میری جیب میں ہے اور ماضی میری ٹھوکر میں۔

میں اب اس مقام پر پہنچ چکا ہوں کہ میری ذات اس ہیرے کی محتاج نہیں۔ یہ خود میرے جسم کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ یہ موسم ..... یہ منظر ..... سب کچھ میری دسترس میں ہے اور یہ دنیا تو بہت ہی چھوٹی ہے

میں مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں

اندھیرے میں ایک تیز سورج سا چمکتا ہے۔

رنگوں کے سات دریا سے گزرتے ہیں۔

ایک ستارہ بہت تیز رفتاری سے میری جانب بڑھتا ہے۔

میں مسکرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں مگر چونک اٹھتا ہوں۔ منظر بدل گیا ہے۔ (شاید ماضی پھر سامنے آگیا ہے۔) میں دیکھ رہا ہوں کہ میلے کاغذ کے ایک ٹکڑے کی طرح میں ادھر اُدھر سر پٹک رہا ہوں۔ میں سب کو پہچان رہا ہوں مگر مجھے کوئی پہچانتا۔ میں سب کو آوازیں دے رہا ہوں مگر میری آواز کوئی نہیں سنتا۔ میرے سارے محافظ ..... سارے دم ساز ..... سارے رفیق اجنبی سے ہو گئے ہیں۔ یہ مجھے پہچانتے کیوں نہیں؟ انھیں علم ہونا چاہیئے کہ میں اس صدی کا سب سے اہم انسان ہوں اور میری جیب میں اتنا بڑا ہیرا ہے کہ میں پوری دنیا کو اپنی دوسری جیب میں رکھ سکتا ہوں۔

میرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھتا ہے۔ میں سوچتا ہوں: اگر اس ہیرے کو چھو لوں گا تو یہ منظر ابھی بھاگ جائیگا۔

میرا ہاتھ اور آگے بڑھتا ہے۔

لیکن جب جیب میں ہیرا ٹٹولتا ہے تو لگتا ہے جیسے دہکتی ہوئی زمین میں دھنس گیا ہو۔ جیب خالی ہے

—— اب میں ہوں اور اسرار کائنات۔

جادو کی طرف

بہت پرانا اور بہت شکستہ سا گھر تھا بوڑھے سپیرے کا۔ کالا۔۔۔ تاریک جیسے زمین دوز کھنڈر۔ اور سپیرا بذاتِ خود یوں لگ رہا تھا جیسے اٹھارویں صدی سے چھلانگ مار کر اچانک سامنے آگیا ہو۔ اس کے گلے میں سانپ کی ریڑھ کی ہڈیوں کا ہار تھا۔ اور سر پر کالی پگڑی۔ جس میں اس نے مور کا پنکھ اڑس رکھا تھا۔

"کیا بات ہے کیسے آنا ہوا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بابا۔۔۔۔۔" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے بابا مت کہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی میں کافی جوان ہوں۔"

"پھر کیا کہوں؟"

"مجھے شاہ صاحب کہو۔" اس نے پگڑی میں اڑسے ہوئے مور کے پنکھ کو ذرا ترچھا کیا۔ "سب مجھے شاہ صاحب کہتے ہیں اور میں شاہ لگتا بھی تو ہوں۔" وہ مسکرانے لگا۔

"ٹھیک ہے شاہ صاحب میں بہت دنوں سے پریشان ہوں۔ ایک سانپ نے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے کالے رنگ کا انتہائی چمکدار اور لمبا سا سانپ ہے وہ۔ بے حد چالاک اور پُراسرار۔ کیونکہ وہ نامعلوم کس طرح غائب ہو جاتا ہے"

"کیا مطلب؟" سپیرے نے حیرت سے کہا۔ "یعنی کہ ایکدم غائب ہو جاتا ہے؟"

"ہاں کل رات جب میں گھر کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہ سامنے ٹیبل پر گلدان کے پاس کنڈلی مار

کہ شاید ہوتا تھا۔ میں نے جلدی سے قریب رکھی ہوئی ایک سلاخ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ غائب تھا۔ پھر میں نے پورے گھر میں اسے تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ وہ سانپ شاید ہوتا آیا ہے۔

"تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"فی الحال تو میں اکیلا ہوں۔ کچھ دن پہلے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔ اپنے ساتھ وہ دونوں بچوں کو بھی لے گئی ہے۔"

"ہوں۔" سپیرے نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ سانپ روزانہ نظر آتا ہے؟"

"ہاں ـــ شاہ صاحب مجھے اس سے نجات دلا دو۔ گھر میں بہت ڈر لگتا ہے۔ رات میں سونا مشکل ہو گیا ہے۔ ڈر ہے کہیں سوتے میں کاٹ نہ لے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اسے پکڑ لوں گا۔ مگر معاوضہ زیادہ دینا پڑے گا کیونکہ بہت پراسرار سانپ لگتا ہے وہ۔ ممکن ہے جادوئی ہو۔"

"جادوئی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا سانپ جادوئی بھی ہوتے ہیں؟"

"ہاں۔ سانپ کیا آج کل تو ہر چیز جادوئی ہوتی جا رہی ہے۔ جو جب چاہے غائب ہو جائے۔"

میں نے بوڑھے سپیرے کو حیرت سے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں طرح کے سانپ پکڑے۔ تم نے شیش ناگ کا نام سنا ہوگا۔ ایک بار میری گرفت میں وہ بھی آ چکا ہے لیکن میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب تک بہت سارے سانپوں نے مجھے ڈسا۔ مگر مجھ پر کسی کے بھی زہر کا اثر نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے انسان کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کے آگے سانپ کا زہر بے اثر ہے۔ کتنا خوبصورت لگتا ہے وہ۔ لوگ اس سے خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ اچھا چلو ...... اس پراسرار سانپ کو میں ابھی پکڑتا ہوں۔"

"شاہ صاحب میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

سپیرے کو ساتھ لے کر میں گھر کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں چلتے چلتے میں نے پوچھا۔

"شاہ صاحب! آپ نے اپنی پگڑی میں مور کا پنکھ کیوں لگا رکھا ہے؟"

"یہ میرے جوان ہونے کی علامت ہے اور میرے خاندانی سلسلے کا ایک نشان بھی ہے۔ میرا

تعلق اس قبیلہ سے ہے جو زہریلے سانپوں کے بستر پر سوتے ہیں اور انہیں اپنے گلے کا ہار سمجھتے ہیں۔ میں بچپن ہی سے اپنے آپ کو ایک تیز طرار سپیرا سمجھتا آرہا ہوں میری صورت بھی تھوڑی بہت سپیرے سے ملتی جلتی ہے۔ میں جب جنگل میں جاتا ہوں تو بہت مزہ آتا ہے۔ خیر چھوڑو...... بہت دنوں سے مجھے اس سانپ کی تلاش ہے جو لعل اگلتا ہے۔"

"شاہ صاحب۔ میرا خیال ہے وہ سانپ صرف داستانوں میں ملے گا۔"

"ارے اُسے پکڑنے کیلئے تو میں داستانوں میں بھی گھس جاؤں گا۔ ابھی میں کافی جوان ہوں۔"

گھر پہونچ کر میں نے دروازہ کھولا۔

سپیرے نے ایک ہاتھ میں کالا کپڑا سنبھالا اور دوسرے میں بین۔ میں نے جلدی سے گھر کا جائزہ لیا۔ سانپ کہیں نظر نہیں آیا۔

سپیرے نے کہا۔ "میں بین بجاتا ہوں تم دیکھتے رہنا وہ کدھر سے آتا ہے۔"

وہ بین لے کر فرش پر بیٹھ گیا اور بجانے لگا۔ بین کی آواز سے پورا گھر گونج اٹھا۔ آواز کافی سریلی تھی۔ میں ایکدم چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ بین بجاتے بجاتے سپیرا خود ہی جھومنے لگا۔

کافی وقت گذر گیا۔

سپیرا بین بجاتے بجاتے تھک گیا

"وہ ضرور کہیں چھپا ہوا ہے۔"

پھر ہم نے ایک ایک سامان اُلٹ پلٹ کر کے اسے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ مگر وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔

سپیرے نے کھسیا کر کہا

"یہاں سانپ تو کیا سانپ کا بچہ بھی نہیں ہے۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ اگر وہ ہوتا تو اس بین کی آواز پر ضرور آتا۔ اسے سانپ کیا میری بین پر تو بھینس بھی ناچنے لگتی ہے۔"

اس رات جب پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھلی اور میں نے بتی جلائی تو دیکھا کہ وہ نہایت پرسکون انداز میں فرش پر رینگ رہا تھا۔ خوف کی وجہ سے میرے جسم میں کپکپی دوڑنے لگی۔

اچانک اس نے پھن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی چمکدار آنکھیں ...... میں سکتے میں آگیا۔ ان آنکھوں کی تاب لانا ناممکن تھا۔ مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مسلسل گھور رہا ہے اور میں گہرے اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں......

غور سے دیکھا تو منظر بدلا ہوا نظر آیا۔

ایک سائیں سائیں کرتا ہوا تاریک جنگل ہے۔ میں ایک اونچے درخت پر ایک ایسا وزنا دار خود لئے ہوئے بیٹھا ہوں جس پر نوکدار کیلیں جڑی ہوئی ہیں اور جس کے اوپری حصے سے ایک مضبوط سی رسی بندھی ہے۔ میں درخت پر بیٹھا غور سے نیچے کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اچانک قریب کی چٹانوں سے پھنکارنے کی آوازیں آتی ہیں اور ایک چمکدار طویل سایہ چٹانوں سے نکل کر درخت کے نیچے آتا ہے۔ سانپوں کا بادشاہ۔

یک بیک جنگل جگمگ کرنے لگتا ہے۔ اس نے لعل اُگل دیا ہے۔ میں اس کی روشنی میں دیکھتا ہوں یہ وہی سانپ ہے جو بہت دنوں سے مجھے تنگ کئے ہوئے ہے اور جس نے میرے گھر پر قبضہ جما رکھا ہے۔ لعل کی روشنی میں وہ رینگتا ہوا کچھ دور چلا جاتا ہے۔ میں جلدی سے لوہے کی ٹوپی کو درخت سے نیچے لٹکا کر رسی ڈھیلی کرتا ہوں ٹوپی لعل پر پہونچ کر اسے ڈھانک لیتی ہے۔ جنگل میں گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ پھر سانپ کی سرسراہٹ اور اس کے پھنکارنے کی غصیلی آوازیں اور کھٹ کھٹ ..... شاید وہ نوکدار کیلوں پر پھن مار رہا ہے۔ اب یہ لعل میرا ہے۔ میں خوش ہو کر درخت سے نیچے اترتا ہوں۔ یہ تو میرا اپنا گھر ہے۔

شاید بچپن میں پڑھی ہوئی کوئی کہانی مجھ میں منظر تان رہی ہے۔ یا ممکن ہے میں نے کوئی روحانی سفر طے کیا ہو۔

کئی دن بعد میں نے دوستوں کو تمام واقعات سنائے اور کہا کہ مجھے اس موذی سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ بتائیں۔ میں بہت تنگ آگیا ہوں اس سے۔ اب تو سوتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہی رینگ رہا ہے۔ بہت ڈر لگتا ہے۔ اکثر آئینہ میں بھی نظر آجاتا ہے۔

تمام واقعات سن کر دوست کافی حیران ہوئے۔ پھر انہوں نے آپس میں صلاح و مشورے کرکے

بعد کچھ طے کیا اور مجھے زبردستی ایک عامل کے پاس لے گئے۔

عامل اپنی وضع کے لحاظ سے بذاتِ خود آسیب زدہ لگ رہے تھے۔ لمبے لمبے بال۔ لال لال آنکھوں میں سُرمہ۔ سر پر سبز صافہ گلے میں بڑا سا پیلا رومال۔ انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں اور ہاتھ میں مورچھل۔ انہوں نے پہلے تو مجھے گھور گھور کر دیکھا پھر میرے سر پر مورچھل مار کر کہا۔

"اچھا تو تمہیں آئینہ میں بھی سانپ نظر آتا ہے؟"

"جی ہاں ـــــ وہ جیسے میرے دماغ میں گھس گیا ہے۔ میں اس سانپ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں"۔

"ہُوں"۔ انھوں نے رومال سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا اور خوابناک آواز میں کہنے لگے۔ "میں ایک زبردست عامل ہوں میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ سانپ نہیں بلکہ آسیب ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تم اس کے جھپاٹے میں آگئے ہو"۔

"جھپاٹے میں یعنی؟" میں نے پوچھا۔

"یعنی کہ تم اس کی زد میں یا لپیٹ میں آگئے ہو" میرے ایک دوست نے وضاحت کی۔

"مگر میں آسیب پر یقین نہیں رکھتا"۔

عامل نے چہرے سے رومال ہٹا کر مجھے حیرت سے دیکھا۔

"اگر تم آسیب پر یقین نہیں رکھتے تو میرا خیال ہے تم یہاں موجود ہی نہیں ہو۔ ہماری پوری کا دنیا' ہمارا دور سب کچھ یقین کی حد میں ہے۔ بے یقینی ایک خود فریبی ہے۔ اس میں مبتلا ہو کر ہم بہت ساری سچائیوں سے انکار کر دیتے ہیں۔ تم آسیب پر یقین نہیں رکھتے۔ نہ سہی۔ مگر آسیب تو تم پر یقین رکھتا ہے! اب بتلاؤ اس سانپ سے کیسے نجات حاصل کرو گے جس کی وجہ سے تم کافی پریشان ہو۔ ممکن ہے کوئی دن وہ اپنا زہر تمہارے بدن میں اتار دے"۔

میں لاجواب ہوگیا۔

دوستوں نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ میں ان کی باتیں مان لوں لہٰذا میں نے ان سے کہا۔

"عامل صاحب! میں آپ کی سب باتیں ماننے کے لئے تیار ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا مگر مجھے کسی بھی طرح اس سے جلد نجات دلا دیجئے"۔

انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بہت جلد اسے بوتل میں بند کر کے دریا میں ڈال دوں گا۔ وہ تم سے اس لئے چمٹا ہوا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تم نے اس کے سر پر کچرا ڈال دیا تھا۔"

"کچرا؟"

"ہاں ـــــ مگر فکر مت کرو۔ اب میں خود اس کا کچرا کر دوں گا۔ سب جانتے ہیں کہ سارے آسیب میرے علم کے جاہ و جلال سے پناہ مانگتے ہیں۔ تم کل اپنے ساتھ ایک کالی مرغی لے کر آؤ۔ مگر یاد رکھو! اس کا ایک بھی پر سفید نہیں ہونا چاہیئے۔"

"عامل صاحب" ایک دوست نے کہا۔ "اگر اس مرغی کا ایک آدھ پر سفید ہو تو کیا ہم اسے رنگ کر کالا کر سکتے ہیں؟"

"بے شک کر سکتے ہو۔" انہوں نے لوبان کی ایک پڑیا مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "اسے آج رات اپنے گھر میں جلا دینا۔ وہ بھاگ جائے گا۔ پھر کل تم کالی مرغی لے کر آؤ۔ میں یہاں بیٹھ کر اس پر عمل کروں گا۔ تو وہ آسیب کچے دھاگے میں بندھا ہوا آئے گا اور بوتل میں گھس جائے گا...... اب تم جا سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے میرے سر پر پھر ہلکے سے مورچھل مارا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر طمانیت کی لہر دوڑنے لگی ہے۔

میں دوستوں کے ساتھ خوشی خوشی واپس ہوا۔

رات میں نے لوبان جلا دی۔ گھر دھوئیں سے بھر گیا۔ سانپ واقعی کہیں نظر نہیں آیا۔ میں کافی دیر تک چاروں طرف دیکھتا رہا اس کے بعد اطمینان سے پلنگ پر دراز ہو گیا اور سوچنے لگا کہ واقعی عامل صاحب نے مجھے ایک بہت بڑے عفریت سے بچا لیا ہے۔

اچانک بہت زور سے پھنکارنے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ـــــ سامنے دیکھا تو فرش پر وہی کالا چمکدار پُراسرار گزندہ مجھے انتہائی غضیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پھنکار، لپلپاتی ہوئی زبان اور پُرجوش پھن کو دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ پورا جسم یک بیک پسینہ میں تر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھرانے لگے اور دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے برقی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ان میں ایک عجیب سا سحر تھا۔ ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ باوجود کوشش کے بھی میں اپنی نگاہیں وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں جیسے مسحور ہو چکا ہوں اور انتہائی ہلکا ہو کر اسکی

آنکھوں کی شعاعوں میں ٹنگ گیا ہوں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا سارا وجود تسخیر ہو چکا ہے اور اب اپنی قوت بحال کرنا ناممکن ہے۔

مجھ پر تو یہی کیفیت سی طاری ہونے لگی۔

سامنے وہ مجھے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ اس کی پھنکار اب ہلکی تھی لیکن دونوں سرگرم اور پھن بار بار اتار چڑھاؤ کی وجہ سے متغیر تھا۔ میرے ہونٹ جیسے خود بخود کھل گئے۔

"تم کون ہو ـــــ میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟"

سانپ نے بہت زور سے پھن ہلایا اور کہا "مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔ بڈھا سپیرا کہہ رہا تھا کہ تم کوئی جادوئی سانپ ہو، مگر کیا یہ سچ ہے؟"

"بوڑھا سپیرا سٹھیا گیا ہے۔" سانپ نے پھن لہرا کر کہا۔ "میں جادو سے بہت آگے ہوں۔"

"میں نے تمہیں غائب ہوتے دیکھا ہے۔ مگر میں جادو پر یقین نہیں رکھتا۔"

"جادو ہر دور میں روپ بدل سکتا ہے۔ میں اس دور کا زندہ جادو ہوں۔ واحد۔ محیط اور بسیط۔"

"مگر عامل صاحب تو کہہ رہے تھے کہ تم کوئی آسیب ہو۔ یعنی دیو، جن یا بھوت وغیرہ۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے کبھی تمہارے سر پر کپڑا ڈال دیا تھا۔"

"تو کیا تم آسیب پر یقین نہیں رکھتے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے کہا "بعض سچائیاں بہت مشکوک ہوتی ہیں اور کسی بھی چیز پر سے شک کی ردا اتارنا بہت مشکل ہے۔ جب تک کوئی تجربہ نہ ہو جائے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے حواس مجتمع ہو رہے ہیں اور قوت بحال ہو رہی ہے۔ میں نے طنزیہ کہا

"شاید تم مثبت انداز میں گفتگو کر رہے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ میرے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ میں نے اگر تمہارے سر پر کپڑا ڈال دیا تو کیا برا کیا؟"

"یہ گھر اب میری تحویل میں ہے۔ تم اس گھر سے دستبردار ہو جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے۔ تم خود یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہارے لئے نوکیلے کیلوں سے جڑا ہوا ایک خود بنواؤں گا۔"

سانپ نے کھیا کر بہت زور سے پھن لہرایا اور پھنکار کر کہا
"مجھ سے مقابلہ آرائی مت کرو۔ یاد رکھو میں کسی وقت بھی تمہیں ڈس لوں گا اور تم یوں سبز ہو جاؤ گے جیسے تمہارے عامل کا صافہ۔"

پھر میں نے دیکھا کہ وہ دھندلا گیا اور آہستہ آہستہ تحلیل ہونے لگا۔

"جادو...... آسیب...... جن......" میں بڑبڑانے لگا۔

دوسرے دن میں نے پھر دوستوں کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا اور کہا کہ اب مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے کیونکہ اس کے اور میرے درمیان کے تنازعہ کی وجہ سے میرا پورا گھر ہی متنازعہ ہو گیا ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ مجھے ڈس لے گا۔ وہ گزندہ ہے گزندہ۔ اس کے اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجھے مار کر میرے گھر پر قبضہ جمانے کی دھن میں ہے۔"

"تو تم نے اس سے باتیں بھی کیں؟" دوستوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ــــ وہ خود کو مافوق الفطرت سمجھتا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس کے سر پر ایک بار پھر کپڑا ڈال دوں اور تحلیل ہو جاؤں۔"

دوستوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور مجھے ایک ماہر نفسیات کے پاس لے گئے۔

ماہر نفسیات نے مجھے عینک کی اوٹ سے دیکھ کر بہت خوش اخلاقی سے کہا۔
"میں تم سے صرف تین سوال کروں گا۔ ہر سوال کا جواب سچ سچ دینا اور یاد رکھو کہ میں ماہر نفسیات کے علاوہ ایک ہپناٹسٹ بھی ہوں لہٰذا کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا۔"

"پوچھئے۔"

"سوال نمبر ۱: کیا تم اتنی بیزاری محسوس کرتے ہو کہ تمہارا ارادہ خودکشی کرنے کا ہو جاتا ہے؟"

"جی نہیں۔"

سوال نمبر ۲: کیا کبھی تم جی بھر کر رونا چاہتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

سوال نمبر ۳: کیا کبھی کبھی تمہارا جی چاہتا ہے کہ کسی کا خون کر دیا جائے؟"

"جی ہاں۔"

"کس کا؟" ماہر نفسیات کا چہرہ کھل اٹھا۔

"سانپ کا۔"

"سانپ کا؟" ماہر نفسیات نے حیرت سے کہا

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ بہت کالا اور چمکدار سانپ ہے وہ۔ وہ خود کو جادو اور آسیب سے بھی ایک قدم آگے سمجھتا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"یہ سب سچ ہے۔ وہ مجھے مار کر میرے گھر پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ اس کے اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں ان سے سب کچھ ظاہر ہو چکا ہے۔"

ماہر نفسیات نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر میرے دوستوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کل دوبارہ انھیں لے کر آؤ۔ میں ان کا علاج کل سے شروع کر دوں گا۔ کیس بہت پیچیدہ ہے مگر فکر مت کرو۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "مگر میں ٹھیک اور بہ ہوش و حواس ہوں۔"

ماہر نفسیات نے مسکرا کر کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔"

لیکن مجھے اس کا جملہ تشکیک آمیز محسوس ہوا۔

شام میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ لوہے کی وہ ٹوپی ضرور بنواؤں گا۔ اس زہریلے سانپ سے نجات حاصل کرنے کا بس یہی ایک راستہ ہے کہ لوہے کی وہ ٹوپی اس کے پھن پر گرا دوں تاکہ وہ اپنے جادو سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گھر کے سامنے ایک ٹیکسی آ کر رکی اور آوازیں آئیں۔

"پپا ــــ پپا!"

باہر نکل کر دیکھا تو بیوی بچے واپس آ گئے تھے۔ میں خوشی میں جھوم اٹھا۔ بڑھ کر بچوں کو گلے لگایا اور بیوی سے پوچھا۔ "کیسی ہو؟"

جواب میں وہ مسکرائی۔

مگر میں لرز اٹھا کہ اب اپنی جان بچاؤں یا ان سب کی ؟ وہ اس گزندے کے حصار میں تو اب بیوی اور بچے بھی آ گئے ہیں۔ میں جیسے اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ جی چاہا خوب روؤں، مگر میں نے ان پر کچھ بھی ظاہر ہونے نہیں دیا۔

ان سب کے آنے سے گھر میں جیسے بہار آ گئی۔ پورے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ چہل پہل۔ رونق، ہنسی۔ خوشی۔ شور۔ ہنگامہ۔ ریڈیو بجنے لگا۔ دیواروں پر گھڑی ٹک ٹک کرنے لگی۔ کچن میں کھٹ پٹ ہونے لگی۔ برتن کھنکنے لگے۔

اور میں رات کے آنے کے تصور سے کانپ رہا تھا۔

کہ وہ کسی نہ کسی کو ڈس لے گا۔

رات آئی ——— میں جاگتا رہا۔

مگر وہ گزندہ اس چہکتے ہوئے گھر میں پھر کبھی نہیں آیا۔ اکثر میں سوچتا ہوں۔

جادو وہ تھا یا جادو یہ ہے۔

تاریک نخلستان

اور پھر ہاتھوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

سمندر کے سنہرے قید خانے سے نکل کر میں ناک کی سیدھ میں دوڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے جلد سے جلد تاریک نخلستان تک پہونچنا ہے، جو بہترین پناہ گاہ ہے۔ پیچھے سے کئی ترنگ کی آوازیں آتی ہیں۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں ــــ سمندر کی سطح سے ہزاروں ہاتھ باہر نکل آئے ہیں۔ وہ مجھے بلا رہے ہیں کہ میں ان کی طرف واپس ہو جاؤں، لیکن میں آنکھ میچ کر پھر بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔ ریت میں میرے پاؤں زور زور سے بجد بجد کرتے ہیں۔ میں آنکھیں کھول کر اوپر دیکھتا ہوں۔ ایک سیاہ پروں والا عقاب سر پہ منڈلا رہا ہے۔ اس کی شکل بالکل صلیب جیسی ہے

"تو میرے سر پر صلیب ہے؟ بھاگو!"

میں اور تیز دوڑتا ہوں۔ سمندر کی طرف سے شور بڑھ جاتا ہے۔ میں پھر مُڑ کر دیکھتا ہوں۔ اس کی سطح سے نکلے ہوئے ہاتھ اور بھی لمبے ہو گئے ہیں، بلکہ وہاں ہاتھوں کا ایک جنگل کھڑا ہو گیا ہے۔ لیکن اب تو میں ان کی پہونچ سے بہت دور ہوں۔ پاؤں کے نیچے کی ریت پتھریں بدل گئی ہے۔ آس پاس سے کچھ باس آ رہی ہے جیسے دونوں طرف سڑی ہوئی لاشوں کے ڈھیر ہوں۔ اُف، کتنی بدبو ہے۔ بھاگو! ــــ

اردگرد بھوری بھوری بہاڑیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ سب راکھ کی ہیں شاید۔ میری آنکھ اوپر اٹھتی ہے ــــ عقاب ابھی تک سر پر تیر رہا ہے۔ سمندر کا شور ذرا کم ہو گیا ہے ــــ اب اور کم ہو گیا ہے۔ شاید میں اس سے بہت دور نکل آیا ہوں...... میری نظر اپنے بدن پر جاتی ہے۔

اور ہوا ——— مجھے حیرت ہوتی ہے بدن پر سبزہ اُگ آیا ہے۔ میں اپنی انگلیوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ ناخن لمبے ہو گئے ہیں۔ بال پیٹھ تک اتر چکے ہیں۔ میں ناخن سے تھوڑا سا سبزہ کھرچ کر چکھتا ہوں۔ واہ اسکا مزہ تو بالکل سینڈوچ جیسا ہے میری رال بہنے لگی ہے۔ پھر مسلسل بہتی رہتی ہے۔ تاریک نخلستان ابھی بہت دور ہے۔

"اس وقت اگر ایک بوتل مل جائے تو اچھا ہے"

میرا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکراتا ہے۔ نظریں نیچے جاتی ہیں۔

کھوپڑی ہے ———

میں اسے زور سے ٹھوکر مارتا ہوں۔ وہ اڑ کر راکھ کے ڈھیر میں دھنس جاتی ہے۔ ڈھیر پر بہت ساری چنگاریاں ناچ اٹھتی ہیں۔

"تو یہ راکھ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی؟"

سامنے ایک سونے کا بت ہے۔ کوئی بادشاہ ہے یہ۔ ارے اس کے ہاتھ میں سونے کا پنجرہ ہے۔

بھاگو!

سمندر کا شور دیر ہوئی ختم ہو چکا ہے۔ کہیں مجھے دوڑتے دوڑتے ہزاروں صدیاں تو نہیں بیت گئیں؟ پاؤں کے نیچے زمین اب سخت ہو چلی ہے۔ غالباً پتھر کا فرش ہے۔ قریب ہی اونچے اونچے سفید سنگی ستون کھڑے ہیں۔ ایک طرف ایک سیاہ سا دھبہ نظر آ رہا ہے۔ اس کا ہیولا بالکل ابوالہول جیسا ہے۔ ایک مجسمہ زمین پر اوندھا پڑا ہے۔ اس کا تاج اس کی بغل میں دبا ہوا ہے۔ یہ ضرور کسی فرعون کا مجسمہ ہے۔ اسے ایک لات ضرور ملنا چاہیئے۔ بس اب بھاگو ورنہ راستہ کٹا تو خیر نہیں۔ واہ کیا جم کے ملا تھا۔

..... عقاب ابھی تک سر پر پرواز کر رہا ہے۔ سچ مچ صلیب نظر آ رہا ہے۔ آخر یہ میرے تعاقب میں کیوں ہے۔ (سوال)

——— اب چاروں سمت جنگل گھومنے لگا ہے۔ طرح طرح کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ شاید میں زمین کے گرد ہزاروں چکر لگا چکا ہوں۔ لیکن یہ جنگل ختم کیوں نہیں ہو رہا ہے؟

میں سامنے دیکھتا ہوں۔

"ٹانگوں میں اور قوت آ جاتی ہے۔ نخلستان کی سرحد قریب تر ہے۔

(جنگل گھومتا رہتا ہے)

اب میں نخلستان کی سرحد پر پہونچ چکا ہوں۔ جنگل پیچھے چلا گیا ہے۔ نخلستان سامنے منہ پھاڑے ہوئے غار کے اس پار ہے۔ بدن پر سبزہ اور بھی گھنا ہو گیا ہے۔ میں ایک ہاتھ سے ذرا سا کھرچتا ہوں، اور چکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہاتھ منہ کی بجائے تھوتھنی سے ٹکرا جاتے ہیں۔

"ارے یہ کیا؟" میں پانی میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں۔ منہ تھوتھنی میں کیسے بدل گیا؟ لیکن اب میں کتنا اچھا لگ رہا ہوں۔ چہرے سے جھوٹ کی ساری تہ اتر چکی ہے۔ اب میں صحیح طور پر جلال و جمال کی کیفیت میں ہوں۔ اس حالت میں اگر کوئی لڑکی دیکھ لے گی تو یقیناً مجھے دبوچ لے گی۔ لیکن اچھا ہے کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ چلو۔

ایک گہری سانس لے کر میں غار کے دہانے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اِدھر اُدھر پتھروں کے ہتھیار بکھرے پڑے ہیں۔ کچھ سیپیوں کے ہار بھی لٹک رہے ہیں۔

"وہ لوگ یہ سب چھوڑ کر کہاں گئے؟"

آگے اندھیرا ہے (میں چلتا رہتا ہوں) کچھ شور سنائی دے رہا ہے۔ اور جوں جوں آگے بڑھ رہا ہوں، شور بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر بہت آہستہ سے مدھم مدھم روشنی نمودار ہوتی ہے۔ پاؤں کے نیچے ریت سی لگ رہی ہے۔ شاید غار کا دوسرا دہانہ قریب ہے۔ اب میرے قدم نخلستان پر ہوں گے۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اب میں سمندر کی پہونچ سے باہر ہوں۔ وہ قید خانہ اور وہ ہاتھ اب مجھ تک نہیں پہونچ سکتے۔

میں غار کے دوسرے دہانے پر پہونچ کر ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہوں ــــ "نخلستان!" لیکن سامنے دیکھتا ہوں تو قہقہہ چیخ میں بدل جاتا ہے۔

سامنے وہی سمندر پھیلا ہے جس پر ہزاروں ہاتھوں کا جنگل اگا ہے۔

اور صلیب نما عقاب سر پہ ہے۔

میزان ؟

بس ابھی چند منٹ بعد ــــــ

اس عظیم الشان جلسہ میں اسے سب کے سامنے چاندی میں تولا جائے گا۔ (چاندی اصلی ہوگی)
تمام آنکھیں اسے نہایت ہی احترام و عقیدت کے ساتھ دیکھ رہی ہیں کہ اس نے اپنی پوری زندگی جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ عظیم ، معرکہ آرا اور بے مثال ہیں۔ (یہ انکشاف گزشتہ چند دن پہلے ہوا ہے) جلسہ گاہ میں وہ لوگ زیادہ آگے بیٹھے ہیں جو پہلے اسے ٹھیک طرح سے پہچانتے بھی نہیں تھے۔

وہ پتھر کے بُت کی طرح خاموش لیکن مختلف خیالات میں الجھا ہوا ہے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ ایک اجنبی جگہ میں آگیا ہے اور سب نے اسے اچانک پہچان لیا ہے

تقریریں شباب پر ہیں۔

مقررین اس کے کارنامے پر کم اور اپنے کارناموں پر زیادہ روشنی ڈال کر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تقریر کرنے کا صحیح فن انہیں خوب آتا ہے۔ فوٹو گرافر اور اخباری رپورٹر کیمرہ، قلم ، نوٹ بک ، سگریٹ ، چیونگ گم اور چشمہ بردار ابنِ بشر کے آس پاس گشت کر رہے ہیں۔ جلسہ گاہ سے تھوڑے فاصلے پر کاروں کی لمبی لائن اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ شہر کا ہر معزز شخص یہاں موجود ہے اور صدر کی میز پر پھولوں کے ہار اور گلدستوں کے ڈھیر اس بات کے غماز ہیں کہ صدر کوئی بہت بڑا آدمی ہے اور اسے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ صدر بنایا گیا ہے۔

وہ صدر کی برابر والی نشست پر بیٹھا تقریروں اور کیمرے کی فلیش لائٹ سے بار بار چونک رہا ہے

صالحہ زرین

اسکی انگلیاں کچھ کپکپا رہی ہیں شاید یہ احساس کہ تھوڑی دیر کے بعد اسکا پورا وجود چاندی کی چمک دمک سے چکا چوند ہو جائیگا لیکن..... اسکے کارناموں کا بدل کیا یہ چاندی ہے؟

وہ خیالات کے تیز بھنور میں اترتا جا رہا ہے۔

اس نے اپنی پوری زندگی میں جو کچھ کیا ہے۔ یہ چاندی اسکا اعتراف ہے یا سودا! کیا اس طرح حساب برابر ہو جائیگا کیا یہ چاندی اسکی خدمات سے آنکھ ملا سکتی ہے؟ سب نے اسے بہت دیر بعد ہی پہچانا تو ہے۔ اسکا شکریہ لیکن.....

اسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسکے کاندھوں پر کوئی بھاری بوجھ اترنے والا ہے۔

اناؤنسر اعلان کر رہا ہے۔

"حضرات! تقریریں ختم ہو چکی ہیں اور اب ہم اس جلسہ کے سب سے اہم 'مبارک' شاندار اور چمکتے ہوئے پہلو کی طرف آتے ہیں کہ اس عظیم شخصیت کی ناقابلِ فراموش خدمات کا اعتراف انہیں چاندی میں تول کر کیا جائیگا۔"

(جلسہ گاہ تالیوں کے زوردار شور سے گونج اٹھتا ہے)

وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ حاضرین میں ایک عجیب سی طغیانی پیدا ہو جاتی ہے۔ سب اُچک اُچک کر اسکی طرف دیکھتے ہیں

اور وہ لمحہ اب سب کے سامنے ہے جو چاندی کی بارات لے کر آیا ہے۔

اسکے ماتھے پر پسینہ آگیا ہے۔ ہاتھ پاؤں تیزی سے تھر تھرا رہے ہیں۔ وہ اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو رخصت ہوتے ہوئے رنگوں کو روکنا چاہتا ہے مگر ناکام ہو جاتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دوسری طرف جوں جوں چاندی کے وزن میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کوئی شے اسے جھنجھوڑ کر اسکے اندر سے باہر نکل رہی ہے اسے کچھ کھونے کا احساس ہو رہا ہے یا وہ کچھ خالی ہوتا جا رہا ہے.....

دفعتاً اس کے بدن میں ایک زور کا لرزہ آتا ہے اور وہ ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گر جاتا ہے۔

ایک رپورٹر اپنی نوٹ بک میں لکھتا ہے۔

"..... جونہی چاندی کا وزن اس کے برابر ہوا 'وہ اپنے جسم سے علاحدہ ہو گیا۔"

اُس لمحے کا چہرہ

ورما صاحب کے ڈرائنگ روم میں یہ تصویر کتنی بھلی لگتی ہے۔

آٹھ کوئی سال بعد میں ان سے ملنے گیا ہوں۔ وہ بونڈ میں سگار جلائے اپنی نئی شو گرفیکٹری کے کارنامے سنا رہے ہیں۔
میں خاموش ہوں اور دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو ایک ٹک دیکھ رہا ہوں۔ یہ تصویر میری بنائی ہوئی ہے۔
دنیا کتنی گول ہے۔ یہ تصویر ہندوستان میں بنی۔ لندن میں فروخت ہوئی اور کئی مقامات پر گھومتی ہوئی
نیویارک میں ورما صاحب کے ہاتھ لگی۔ اس تصویر نے مجھے دنیا کے بہترین مصوروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن
اس تصویر کا ماضی؟ ورما صاحب اسے بالکل نہیں جانتے۔

لندن کی تصویری نمائش میں شریک ہونے سے پہلے اپنی تصویر کیلئے میں بیحد پریشان تھا۔ مجھے اس لمحے کی تلاش تھی جس میں
پوری زندگی ایک نقطہ پر سمٹ آئی ہو اور اسکا سارا کرب ...... سارا منظر نامہ! اس پینٹنگ میں زندگی کے تمام دکھ درد کو ایک
مرکز پر پیش کرنا میں طے کر چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کسی نہ کسی موڑ پر میری ملاقات اس لمحے سے ضرور ہوگی۔

یہی ڈرائنگ روم تھا۔ تمام صوفے ورما صاحب کے دور و نزدیک کے دوستوں سے پُر تھے۔ وہ بے حد خوش تھے کہ
دوسرے دن کی ریس میں انکے کئی خوش قسمت گھوڑے دوڑنے والے تھے۔ محفل کافی پر لطف تھی لیکن درمیان میں ایک
چھوٹا سا حادثہ ہو گیا۔ انتہائی معمولی حادثہ۔
اسوقت جبکہ سب کے قہقہے شباب پر پہونچ رہے تھے۔ ایک ملازم کے ہاتھ سے ٹرے الٹ گئی۔
محفل میں شیشے کو بج اُٹھے۔
ورما صاحب ہنستے ہنستے رک گئے۔ سارے قہقہے تھم گئے۔ میری نظر اس ملازم کی طرف گھومی میں کانپ اٹھا ــــ
اس کا چہرہ ــــ ؛ اسکا چہرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے لگا اپنی نبض ٹھہرتی محسوس ہوئی۔
کبھی کبھی زندگی کا سارا کرب ایک لمحے میں سمٹ آتا ہے۔
وہ دن اس کی ملازمت کا پہلا دن تھا جس کا ایک لمحہ آج بھی اس تصویر میں زندہ ہے۔
ورما صاحب کے ڈرائنگ روم میں یہ تصویر کتنی بھلی لگتی ہے۔

مرد کی خوشبو

وہ جب بھی کمرے میں آتی ہے میرا پورا وجود آنکھ بن جاتا ہے۔
اس وقت صرف وہ ہوتی ہے اور میں۔
میں اور وہ ــــــ
اسوقت نہ تو کمرے کی دیواریں ہوتی ہیں، نہ کھڑکی دروازے، نہ کتابیں رسائل، نہ تصویریں، نہ گلدان نہ طوطے کا پنجرا!

ہاں ــــــ جب وہ چلی جاتی ہے تب مجھے اپنے سوا کمرے میں بہت سی چیزوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے کتنی حیرت کی بات ہے۔ پورا وجود جب آنکھ بن جاتا ہے تو کتنی ساری چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

اس وقت بھی مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا ہے (وہ کچن میں ہے)
وہ اور میں ــــــ ہم دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ وہ میرے یہاں کام کرتی ہے اور میں اسے اسکی تنخواہ دیتا ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ کوئی ایسی ویسی حرکت مجھ سے ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے دنوں جب اس پر پیار سا آگئی تھی تو اس کی خوشبو نے میرے اندر تھوڑی بہت ہلچل ضرور مچادی تھی۔ بہت سے خوابوں نے دستک بھی دی تھی لیکن میں جلد ہی سنبھل گیا۔ میں اس سے عمر میں کافی بڑا ہوں۔ اس کا میرا کیا رشتہ؟ لیکن ادھر چند دنوں سے میں کچھ عجیب سی سوچ میں مبتلا ہوں۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خوشبو از خود چلی آرہی ہے۔
اور تیز ہوا تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کو دائروں کے رقص پر اکسا رہی ہے۔
میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس ذرا سا...... یوں ہی سا احساس ہوتا ہے کہ اس کے اور میرے درمیان ایک بہت ہی نازک سی کہانی گہری دھند میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہی ہے۔
دھند واقعی بہت گہری ہے۔ کہیں کہیں جگنو چمک رہے ہیں۔ وہ میرے پیچھے چل رہی ہے یا میں اس کے پیچھے چل رہا ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ہوا بہت ہی سبک رفتار ہے۔ اوپر کہکشاں ہے اور سامنے...... یہ طوطے کا پنجرا یہاں کیسے آگیا؟
میں حیران ہوں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کے بارے میں بالکل نہ سوچوں۔ مگر بات تو سراسر سوچنے جیسی ہے۔ وہ لڑکی جو کبھی سر تا پا برف تھی۔ جو بہت کم بولتی تھی۔ جو سب سے بے نیاز اور خود سے بے خبر تھی، جو زینے یوں طے کرتی کہ آواز تک نہ اٹھتی۔ وہ یک بیک گھنگھروؤں کی طرح یوں چھن چھن اٹھی ہے کہ...... یہ کہ نہیں سوچنے کی بات!
ابھی چند روز پہلے جب وہ دھڑ دھڑ زینے چڑھتی ہوئی آئی تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل کی ہلکی ہلکی لکیریں تھیں، بال سلیقے سے آراستہ تھے اور ہونٹوں پر چپکی ہوئی خوبصورت سی مسکراہٹ تھی۔ وہ مسکراہٹ آج بھی قائم ہے
میں گم سم اس کی ایک ایک حرکت دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ مجھے سر تا پا بدلی بدلی سی نظر آرہی ہے (کہیں یہ میرا اپنا خلل تو نہیں؟) نہیں نہیں! میں ایک شریف آدمی ہوں۔ پیش قدمی یا رومان انگیزی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ سب فضول کے تماشے ہیں۔ ہاں اکثر مجھے کچھ کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ لگتا ہے میرے اندر کوئی خلا ہے۔ اکیلا ہوں نا اسلئے۔ یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ اکیلے رہنا کتنا مشکل کام ہے۔ جس گلی سے گذرو ذرا ذرا سی بچیاں کھی کھی کرتی ہیں۔ عورتیں یہ بڑا سا منہ پھاڑے دیکھتی ہیں۔ لوگ جوان لڑکیوں کو گھروں میں بھگا دیتے ہیں کہ کہیں نظر ٹکرا نہ جائے۔ کیا مجال کہ کسی طرف آنکھ اٹھ جائے۔ پتہ نہیں کیوں لوگ اتنا شک کرتے ہیں۔ لوگ تو یقیناً اس کے اور میرے بارے میں بھی شک کرتے ہوں گے بھلا اس کا میرا کیا رشتہ۔ لیکن اس کی مسکراہٹ؟ نہیں وہ مسکراہٹ فضول نہیں ہے۔ اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ کوئی راز ہے۔ کوئی اسرار ہے....

جی چاہتا ہے اس سے پوچھوں۔
مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوچھوں۔ اب تو وہ ہر بات پر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ جیسے پھلجڑی۔۔
.....جیسے ساز بجنے لگتے ہیں۔ جیسے میرے اندر کوئی مور ناچنے لگتا ہے۔ جیسے.......خیر کوئی بات نہیں۔

اس وقت وہ کچن میں کچھ گنگنا رہی ہے۔ کیا وہ میری موجودگی سے بے خبر ہے۔ مجھے کھانسنا چاہیئے (کھوں کھوں) کوئی فائدہ نہیں۔ گنگناہٹ جاری ہے۔ بھلا اس میں اتنی خود اعتمادی کیسے آگئی۔ ابھی کل کی بات ہے۔ گلی کے نکڑ پر دو چار سہیلیوں کے ساتھ ٹھٹھے مار رہی تھی۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے جو جھیل کے پانی کی طرح شانت اور خاموش تھی۔ یقین نہیں آتا۔ بالکل یقین نہیں آتا۔
کچن میں اس کے گنگنانے کی آواز اور تیز ہو گئی ہے۔

شاید وہ مجھے متوجہ کر رہی ہے۔ ممکن ہے میری طرف رجوع ہو۔ مگر وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ سب کچھ دھند میں ہے۔ بہت گہری دھند ہے۔ کہیں کہیں ستارے چمک رہے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت قریب ہے۔ اتنی قریب کہ میں ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام سکتا ہوں۔ مگر دراز دستی میرے بس میں نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ مجھے اب احساس ہونے لگا ہے کہ شریف آدمی کتنے بدنصیب ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حلقہ سے علاحدہ کروں گا۔ اندر کے خلا کو پُر کرنے کا یہ بہت اچھا وقت ہے۔ مجھے اس کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ اس سے پوچھنا چاہیئے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسی بات کہہ دے کہ دھند چھٹ جائے۔ چاند نکل آئے اور کہکشاں سامنے بکھر جائے۔

"سنو!........ میری آواز جیسے ڈوب جاتی ہے۔" ذرا سنو تو۔"
"ہوں۔" کچھ لمحوں بعد وہ سامنے آکر کھڑی ہوتی ہے۔" کہیئے۔"
وہ مسکرا رہی ہے۔ اس کی نظریں میری طرف ہیں۔
"آج کل تم ٹھیک تو ہو نا........ میرا مطلب ہے......"
"کیا مطلب ہے" وہ ہنس پڑتی ہے۔
"یعنی کہ........ چند دنوں سے تم کچھ بدلی بدلی سی الگ رہی ہو۔"
"بدلی بدلی سی؟" وہ میری طرف حیرت سے دیکھتی ہے

"ہاں...... یعنی کہ آج کل تم بہت خوش خوش رہتی ہو۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟" میں بھی مسکراتا ہوں۔

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات بھی نہیں؟"

"نہیں۔" وہ زور سے سر ہلاتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر میری طرف دیکھتی ہے اور دل شرما کر کہتی ہے۔ "ہاں ایک بات ضرور ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میرے اندر ایک خوشبو بھری ہوا بہت زور چلتی ہے۔

"میرا رشتہ لگ گیا ہے۔"

جنگل اے جنگل

شہر سے جنگل کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے

انہوں نے اپنا اپنا اثاثہ ایئر بیگ میں ڈال کر کاندھوں سے لٹکا لیا اور پُر شور جگمگاتے ہوئے شہر کو نہایت تیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

ان میں موجود ایک دراز قد شخص نے فلک بوس عمارتوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔

"اے مہیب پُر انتشار شہر! تیرے مشینی حصار سے نجات اور آزادی حاصل کرنے والے ہم اس عہد کے پہلے انسان کہ تجھے ٹھوکر مار کر سکون، مسرت اور تازگی کی طرف پیش قدمی کے لئے تیار ہیں۔ اب ہمارا ہر قدم چہکتی ہوئی زندگی کی طرف جائیگا۔ ہماری یہ جماعت ماضی کی طرف مراجعت نہیں کرے گی بلکہ سکون، دائمی پناہ اور اطمینان و مسرت کی بازیافت کے لئے جنگلوں کو دوبارہ زیر قدم کرے گی۔ کیوں کہ اس عہد میں جنگلوں کی تسخیر بھی نہایت ضروری ہے۔"

پھر اس نے ایک لمحہ رک کر اپنی آواز کو ذرا گونجدار بنا کر کہا۔

"اے بے رحم، بے حس اور بے ثبات شہر! میں اس ہجرت کرنے والے قافلہ کا امیر یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ایک دن تو خود اپنے آپ کو چکنا چور کر دے گی۔

اور قافلہ چل پڑا۔

ان کی روانگی پر شہر پر کوئی بھی رد عمل نہ ہوا۔

لب شہر بہتے ہوئے دریا کے قریب پہونچ کر انہوں نے ایک بار پیچھے مڑ کر شہر کو گھور کر دیکھا اور

پل پر سے گذرنے لگے۔

"اے سیاہ پل۔ ہم آج تجھ سے بھی اپنا رابطہ ہمیشہ کے لئے ختم کر رہے ہیں"۔

"ہمارے ایئر بیگ کتنے ہلکے پھلکے ہیں"۔

"بے شک ہمارے ایئر بیگ اس زنبیل کی مصداق ہیں جو اپنے اندر بہت سارا مال و اسباب محفوظ کرنے کے بعد بھی ہلکی دکھائی دیتی ہے۔ ان میں ہمارا سارا اثاثہ آگیا اور سارے خواب بھی"۔

پل پار کرنے کے بعد وہ نہایت پرجوش انداز میں اور آگے چلے۔ آگے بہت وسیع ویرانہ تھا۔ تاحد نظر سپاٹ زمین کہیں کہیں خود رو جھاڑیاں اور چھوٹے بڑے پتھر —— وہ چلتے رہے۔

سپاٹ زمین کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ زمین ہے یا تار عنکبوت"۔

سورج غربی افق پر جھک رہا تھا۔ اوپر سے بہت سارے بگلوں کی قطاریں گذرنے لگیں۔

قافلہ سالار نے کہا "بگلے واپس ہو رہے ہیں اب شام ہونے والی ہے اور ہم ابھی تک یہ ویرانہ بھی پار نہیں کرسکے۔ ہمیں اور تیز چلنا چاہیئے"۔

کسی نے کہا "ویرانہ پار کرنے کے بعد زرد صحرا آئے گا۔ وہاں رات گذارنی بہت مشکل رہے گی۔ لہٰذا ہمیں رات اسی ویرانے میں گذارنی چاہیئے۔ یہاں کافی سکون ہے"۔

ایک جھکے ہوئے شانوں والے نے کہا "ہم مہاجروں کیلئے ویرانہ کیا اور صحرا کیا جہاں رات ہوئی وہاں سو گئے۔ جہاں آنکھ کھلی سویرا ابھر آیا"۔

ادرواس والے نے کہا "تم نے دیکھا ہوگا کہ بے رحم شہر پر ہماری ہجرت کا کوئی بھی اثر نہیں ہوا۔ ہمیں دیکھنے کیلئے ایک دریچہ بھی نہیں کھلا۔ ہمیں کسی نے روکا بھی نہیں۔ ہم سے کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ کیوں جا رہے ہو"۔

قافلہ سالار نے سب سے مخاطب ہو کر کہا "ہم شہر میں ذروں اور تنکوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں انسان کی پہچان اور تمام قدریں ختم ہو چکی تھیں۔ ہم مشینوں کے نوالے بنتے جا رہے تھے۔ شہر کو پیر اسانوں کی بجائے کاریں، گھروں اور کارخانوں میں انسانوں کی بجائے خودکار مشینیں اور دیواریں ہی دیواریں۔ ہماری اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ ہم بے مصرف ہو گئے تھے۔ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے اسے ٹھوکر مار

تی۔ ہمارے پیچھے اور بھی بہت سارے قافلے آئیں گے۔ ہمارا تعلق صفِ اوّل سے ہے۔"

"بے شک اب سب کو آنا ہی پڑے گا۔ شہراب سمندر اور طوفان سے زیادہ پُر شور ہو چکا ہے کسی کو اب نیند نہیں آتی۔ اتنی چکا چوند روشنیاں، اتنی گھن گرج، اتنی تیز رفتاری کہ انسان بلڈنگوں، سڑکوں اور دوکانوں میں تنگ گیا ہے۔ ہر شئے اپنی شناخت سے محروم ہو چکی ہے۔ شہر دراصل لوہے کا ایک عفریت بن چکا ہے۔ اس کے شکنجے میں زندگی، پھول اور احساس کی قدر و قیمت ہی کیا ہمارے ہاتھ روبوٹ کے نیچے دب چکے ہیں؟"

"ہماری یہ ہجرت ایک احتجاج بھی ہے۔ اور ایک تھوڑا ابھی ہے بد دماغ شہر کے ماتھے پر۔"

قافلہ اور آگے چلا تو سامنے کھلاز کیکٹس اور ناگ پھنی کی بہت ساری جھاڑیاں دیکھ کر ٹھہر گیا چند بھورے رنگ کی پہاڑی خرگوش ان جھاڑیوں میں سے نکل کر ادھر اُدھر بھاگے۔

قافلہ سالار نے کہا۔ "کیکٹس ——— ہم صحرا سے قریب آچکے ہیں۔ آج کا انسان ناگ پھنی کی ان جھاڑیوں سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ پورے وجود پر کانٹوں کی بہار ہے۔ خود اپنی ہی ذات میں مصلوب۔"

اچانک جھاڑیوں کے پیچھے کچھ آہٹ ہوئی اور ایک لڑکی وہاں سے نکل کر ایک سمت بھاگی۔

"ارے!" سب حیرت زدہ اسے دیکھنے لگے۔

قافلہ سالار نے کہا۔ "دوڑو ——— دوڑو۔ پکڑو۔"

پورا قافلہ اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

لڑکی نے ویرانے میں کئی گشت لگائے۔ کئی بار ہاتھوں میں آئی مگر مچھلی کی طرح پھسل کر پھر بھاگی اور چکمہ بھی دیا۔ لیکن بالآخر ہاتھ آ ہی گئی۔ جولان، دراز قد، چمپئی رنگت اور بھورے بال۔ لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا۔ بانہیں اور سینے کا اوپری حصہ عریاں سا۔ وہ ہرنی کی طرح گھبرائی ہوئی تھی اور خوب ہانپ رہی تھی۔

قافلہ سالار نے اپنے ایئر بیگ میں سے تولیہ نکال کر اس کے حوالے کیا۔ اس نے جلدی سے اسے اپنے شانوں پر لپیٹ لیا۔

"کون ہو تم؟" قافلہ سالار نے نرمی سے پوچھا

"میں؟ ——— میں لڑکی ہوں۔"

"لڑکی تو ہو...... یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، تمہیں بھلی تھوڑی سمجھ رہا ہوں۔ مگر ہو کون۔

یہاں کیوں چھپی ہوئی تھیں ؟"

"شہر میں کچھ بدمعاش میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ میں ان سے بچنے کیلئے نکل بھاگی ہوں۔ وہ لوگ کئی دن سے مجھے تلاش کر رہے تھے۔ اب شاید واپس جا چکے ہوں گے"

"مگر تم ہمیں دیکھ کر کیوں بھاگیں ؟"

"دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے"

"ہم چھاچھ نہیں ہیں" ایک سفید بال والے نے تردید کی۔

لڑکی نے سب کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "آپ سب اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں، کیا یہاں شکار کے لئے آئے ہیں ؟"

"ہم شکاری نہیں مہاجرین ہیں"

"مہاجرین ؟"

"ہاں۔ شہر کے بہیمانہ رویہ اور مخدوش حالات سے تنگ آ کر ہم نے اسے چھوڑ دیا ہے اور اب جنگل کی طرف جا رہے ہیں جہاں سکون ہے، مسرت ہے، زندگی ہے۔ شہر کی طرح قتل و خون، فساد، حادثے، درندگی اور بے ضمیری نہیں۔ ہم وہاں اپنی دنیا کو بے حد خوبصورت بنائیں گے"

"میں بھی شہر سے اکتائی ہوئی ہوں۔ وہاں سب مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے میں انسان نہیں بلکہ کوئی مالِ مسروقہ ہوں کہ ہر کوئی میرا حقدار رہنے کا دعویٰ کرتا ہے"

قافلہ سالار نے کہا۔ "تمہیں اتنی خوبصورت اور جوان بھی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ سب کچھ اسی وجہ سے ہے"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں خود بخود ایسی ہو گئی ہوں۔ شہر میں رہنا اب میرے لئے بہت مشکل ہے۔ ان فلک بوس عمارتوں کے جنگل میں میں کہاں پھنس جاؤں گی کہہ نہیں سکتی۔ کوئی میری آواز بھی نہیں سُنے گا۔ آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں"

"ٹھیک ہے، ہم تمہیں بھی شریکِ قافلہ کرتے ہیں۔ آج سے تم ہماری پناہ میں ہو۔ مگر یاد رکھو قافلہ میں سب سے پیچھے چلنا تاکہ سب کی پشت تمہاری طرف رہے"

لڑکی نے کہا۔ "آپ لوگ یقیناً بہت اچھے انسان ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میں دنیا میں تنہا نہیں ہوں"

سورج جیسے دور بنجر زمین میں دھنس سا گیا تھا۔ مغربی افق گلنار ہو گیا تھا اور ویرانے میں سرخیاں ہی سرخیاں پھیل گئی تھیں۔

"ویرانے کی شام کتنی بھلی لگتی ہے"

قافلہ سالار نے کہا۔ "ہم رات یہیں قیام کریں گے۔ موسم بہت اچھا ہے لہٰذا خیمے لگانے کی ضرورت نہیں"

"ٹھیک ہے ان جھاڑیوں کے پاس ہی ہم پڑاؤ ڈال لیتے ہیں۔ اندھیرا ہونے پر الاؤ روشن کر دیں گے"

سورج ڈوبتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ اوپر ستارے چمکنے لگے۔ الاؤ روشن کر دیا گیا۔ سب کچھ دیر شہر کی برق رفتاری، مصروفیت اور اجنبی پن پر باتیں کرتے رہے پھر اِدھر اُدھر دراز ہو گئے۔ قافلہ سالار کے کہنے کے مطابق لڑکی ان سے تھوڑے فاصلے پر الگ لیٹ گئی۔ الاؤ بجھا دیا گیا۔ تھکن اور ٹھنڈی ٹھنڈی سرسراتی ہوئی ہوا...... سب کو فوراً نیند آ گئی۔

رات میں اچانک کسی وقت قافلہ سالار کی آنکھ کھل گئی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے جلدی جلدی سب کو جگا دیا۔

"سنو مجھے کچھ خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اُدھر سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آ رہی ہیں"

سب اِدھر غور سے دیکھنے لگے۔

"ہاں ــــ بہت سارے گھوڑے آ رہے ہیں اور ان کا رُخ اسی سمت ہے"

قافلہ سالار نے کہا۔ "سب ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جائیں۔ بجھے ہوئے الاؤ پر مٹی ڈال دیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے"

سب جھاڑیوں کے اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئے۔

ٹاپوں کی آوازیں قریب آ گئیں۔

اور پھر انہوں نے دیکھا کہ تاروں کی مدھم مدھم روشنی میں دس پندرہ سیاہ گھوڑے دوڑتے ہوئے چلے آ رہے تھے جن پر سیاہ پوش سوار متحرک تھے۔

"میرا خیال ہے سب قزاق ہیں" سفید بالوں والے نے سرگوشی کی۔

"شی ـــــ چپ رہو"

گھوڑے سوار قریب آکر رک گئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے" ان میں سے ایک نے کہا۔

"میں نے شام میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے اسی جگہ پڑاو ڈالا تھا۔ ان کے پاس اٹیچی تھے۔ وہ سب شہری لباس میں تھے"

"تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ کوئی اور جگہ ہوگی۔ ایسی جھاڑیاں دوسری طرف بھی ہیں"

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ان کے ساتھ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت کچھ ہوگیا ہے۔ اُف کیا بدن تھا اس کا"

"خاموش! تم ہمیشہ غلط خبر لاتے ہو۔ اب چلو کسی دیہات پر حملہ کریں"

"مگر وہ لوگ یہیں تھے۔ ان کے اٹیچی بھرے ہوئے تھے"

"مگر مجھے تمہارا دماغ خالی نظر آرہا ہے۔ چلو!"

تمام گھوڑے ایک سمت مڑ گئے اور کچھ دیر بعد نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

دوسری صبح قافلہ پھر آگے روانہ ہوا۔ آگے کچھ ٹیلے تھے جن کے آس پاس گھاس نظر آرہی تھی۔ وہاں پہونچے تو سب خوش ہوگئے۔ ٹیلوں کے درمیان سے ایک دھان پان سی ندی بہہ رہی تھی۔

قافلہ سالار نے کہا۔ "ہمیں چاہیئے کہ اپنے اپنے واٹر بیگ بھر لیں۔ آگے صحرا ہے وہاں پانی نہیں ملے گا اور جنگل یہاں سے کافی دور ہے"

ندی کے قریب پہونچ کر سب رک گئے۔

"واہ کیا صاف وشفاف پانی ہے۔ جی چاہتا ہے نہالیں"

"ضرور ـــــ اس طرح ہم تازہ دم ہوجائیں گے"

لڑکی ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چلی گئی۔

کافی دیر تک سب ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں نہاتے رہے۔ خوب شور کیا۔ خوب پانی اڑایا۔ احساس ہوا کہ اتنا لطف شہروں میں کبھی نہیں آیا۔ ایک عجیب سی خوشی جسم میں سرایت کرگئی۔ نہانے کے بعد جب سب باہر نکلے تو لڑکی کو نہا کر آتے ہوئے دیکھ کر ایک دم مبہوت رہ گئے۔ وہ ادھر نکھر آئی تھی۔ گیلے گیلے

بال اور سر سے پاؤں تک جمال ہی جمال ۔

اس نے قریب آکر براؤن کوٹ والے کو اشارہ کرتے ہوئے قافلہ سالار سے کہا ” میں جب وہاں نہا رہی تھی تو یہ پتھر کے پیچھے سے جھانک رہا تھا “

قافلہ سالار نے گھور کر براؤن کوٹ والے کو دیکھا

اس نے سر جھکا لیا ” معاف کرنا مجھ سے غلطی ہو گئی “

” ہمارے درمیان اس قسم کی حرکتیں مناسب نہیں ۔ ہم سب ایک بہت ہی اہم راستے پر چل رہے ہیں لہٰذا یہ نہ بھولو کہ ہم نے شہر چھوڑ دیا ہے اور اس وقت صرف اور صرف مہاجر ہیں “

سب براؤن کوٹ والے کو گھورنے لگے ۔

” چلو اب آگے چلیں “

قافلہ آگے روانہ ہوا ۔

سفید بالوں والے نے کہا ۔ ” یہاں کتنا سکون ہے ۔ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے ۔ اس خاموشی اور سکون کے لئے ہم ترس رہے تھے ۔ جب یہاں یہ عالم ہے تو جنگل میں کتنا لطف آئے گا ۔ شہر نے ہمارے سارے خوابوں کو زخموں میں تبدیل کر دیا تھا ۔ وہ شہر ایک زبردست طلسم تھا ۔ ہم ہجوم میں بھی تنہائیاں محسوس کر رہے تھے ۔ اور یہاں یوں لگ رہا ہے جیسے ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں ہمارے درمیان کوئی اجنبیت اور خلا نہیں “

جھکے ہوئے شانوں والے نے کہا ” شہر میں ہماری محنت کا استحصال کیا جاتا تھا ۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا گروہ گٹروں اور گندی نالیوں میں اپنی روزی تلاش کرتا ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہوٹلوں، شراب خانوں اور رقص گاہوں میں پورا شہر کتنا برہنہ ہو چکا ہے ۔ اس شہر میں ہمارا وجود آئینوں کی طرح چکنا چور تھا ۔ ہم ہنسنے مسکرانے اور کسی سے دو لفظ کہنے سے محروم ہو چکے تھے “

قافلہ سالار نے چلتے چلتے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر رک گیا ۔

” میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری رفتار میں فرق آ گیا ہے اور تم آگے دیکھ کر چلنے کی بجائے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہو ۔ یہ سب کچھ اس پگلی کی وجہ سے ہو رہا ہے ۔ اے لڑکی ! ــــــ تم ادھر آگے آجاؤ ۔ میرے ساتھ چلو ! “

لڑکی آگے آ کر اس کے دوش بدوش چلنے لگی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔
"ابھی آپ نے مجھے پگلی کہا تھا۔"
"ہاں کہا تھا۔ مگر مجھ سے زیادہ باتیں مت کرنا۔ میں اس قافلہ کا میر ہوں۔ سرِ قافلہ ہوں۔"
"مگر یہ قافلہ مہاجروں کا ہے۔"
"بے شک! لیکن ہم ایسے مہاجر ہیں جن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے عزم، جوش اور ولولہ کی چمک ہے۔ ہم عظیم جنگل کی تسخیر کے لئے جا رہے ہیں۔ وہاں نئی دنیا آباد کریں گے۔ بس اب زیادہ باتیں مت کرو۔"

قافلہ کچھ اور آگے چلا تو سپاٹ اور بنجر زمین کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سامنے دور دور صحرا اور سرِ پر شام۔ قافلہ سالار نے کہا۔ "ہمیں شب یہیں گزارنی چاہیئے۔ کل صبح ہم صحرا عبور کرنے کے لئے چل پڑیں گے۔ خیمے لگا دیئے جائیں۔"
تھوڑی ہی دیر بعد خیمے لگ گئے اور الاؤ روشن کر دیا گیا۔
"ہم یہاں کتنی آزادی اور طمانیت محسوس کر رہے ہیں۔ ہمارے گرد و پیش ایک بھی دیوار نہیں۔ انسان ازل سے اسی آزادی کی تلاش میں تھا۔ یہ موسم۔ یہ ہوا کے فرحت بخش جھونکے۔ آہا مزہ آ رہا ہے۔"
"جنگل ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے۔" زرد لباس والے نے کہا۔ "کیا تم نے کبھی کوئی ایسی کہانی سُنی ہے جس سے پتہ چلے کہ جنگل بہت عظیم ہے۔"
سفید بالوں والے نے کہا۔ "ایسی کہانی ہم خود بُن رہے ہیں۔ جنگل بیشک بہت عظیم ہے۔ زندگی اور آزادی دونوں کی علامت ہے۔ جنگل ہی ہماری پہلی اور آخری پناہ گاہ ہے۔"
کافی دیر تک باتیں جاری رہیں۔ پھر سب کے خراٹے گونجنے لگے۔
اچانک رات کے کسی پہر میں لڑکی کے چلّانے کی آوازیں ابھریں۔
"بچاؤ ــــــ بچاؤ!"
سب ہڑبڑا کر اٹھے اور اس کے خیمے کی طرف لپکے۔ "کیا بات ہے ــــ کیا بات ہے؟"
لڑکی نے جھکے ہوئے شانوں والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے خیمے میں گھس آیا تھا۔"

قافلہ سالار نے جھکے ہوئے شانوں والے کو بہت غصیلی نظروں سے دیکھا اور سب کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"جی چاہتا ہے اسے قافلہ بدر کر دیا جائے۔ اس بارے میں سب کی کیا رائے ہے؟"

سب نے کہا۔ "نکال دیا جائے۔"

جھکے ہوئے شانوں والے نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں نہیں ایسا مت کیجئے۔ میں اکیلے کہاں جاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ معاف کرنا مجھے نامعلوم کیا ہو گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھنا۔ ورنہ بہت سخت سزا دی جائے گی۔"

دوسری صبح قافلہ صحرا پر تھا۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے اور ڈھلان۔ پاؤں ایوں دھنس رہے تھے کہ چلنا مشکل تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور چلنے کے بعد قافلہ تھک تھک جاتا تھا۔ دوپہر تک سب کی حالت غیر ہو گئی۔ چلچلاتی دھوپ اور چاروں سمت سراب۔

قافلہ سالار نے کہا "ہمت سے کام لو۔ یہ صحرا کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے اسے پار کرنے کے بعد عظیم جنگل ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "کاش جنگل شہر سے اتنی دور نہ ہوتا ——— میری تو ٹانگیں جواب دے چکی ہیں۔"

"جنگل کا شہر سے دور ہونا ہی بہتر ہے اسی لئے وہاں امن و سکون ہے۔"

"کیا ہمیں جنگل میں تنہائی کا احساس نہیں ہوگا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ جنگل میں ہمارا دل جھومے گا۔ روح گنگنائے گی......"

"شہر کتنا بے رحم ہو گیا ہے۔ سب بھیڑیئے بستے ہیں وہاں۔"

"بس اب زیادہ باتیں مت کرو۔ پیچھے سب سرگوشیاں کرنے لگے ہیں۔"

کچھ دیر بعد قافلہ کے آخری حصہ سے کچھ تیز آوازیں ابھریں۔ قافلہ سالار نے مڑ کر دیکھا تو جھکے ہوئے شانوں والا براؤن کوٹ والے سے گتھم گتھا تھا۔ وہ لپک کر ان کے قریب گیا۔ "انھیں چھڑاؤ۔"

کافی کوشش کے بعد دونوں الگ الگ کر دیا گیا۔

"کیا بات ہے تم دونوں جھگڑا کیوں کر رہے تھے؟"

دونوں خاموش رہے۔

"بولو خاموش کیوں ہو؟"

براؤن کوٹ والے نے جھکے ہوئے شانوں والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھ سے کہہ رہا تھا یہ لڑکی صرف میری ہے اس کی طرف دیکھنا نہیں۔"

قافلہ سالار نے بگڑ کر کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اگر اس قسم کی حرکتیں ہوتی رہیں تو ہم جنگل تک بھی نہیں پہونچ سکیں گے۔ ذرا کچھ تو سوچو کہ ہم زندگی بربریت سے نجات کی سمت جا رہے ہیں۔ ایک نہایت اہم منزل کی طرف گامزن ہیں۔ ہماری ذرا سی بھول ہمیں شہر واپس بھیج سکتی ہے۔ اے قافلہ والو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔

"نہیں نہیں" سب کے ہونٹوں سے نکلا۔ "آپ بہت ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"تو اے اہل قافلہ عظیم جنگل ہمیں آواز دے رہا ہے۔ ہمیں راہ میں اختلاف پیدا کرنے کی بجائے اس کی جانب بڑھنا چاہیئے۔ وہاں ایک نئی دنیا ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ سکون اپنی باہیں پھیلا کر کھڑا ہے۔"

پھر اس نے لڑکی سے کہا۔ "تمہیں شریک قافلہ کر کے میں بہت پچھتا رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے تنازعہ پیدا ہو رہا ہے۔"

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

قافلہ سالار نے کہا۔ "خیر رونے کی ضرورت نہیں چلو آگے بڑھو۔ تم بے قصور ہو۔"

قافلہ پھر آگے چلا۔

کئی دن گذر گئے۔

"میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔" لڑکی نے قافلہ سالار سے کہا۔

"کہو"

"آج صبح وہ جھکے ہوئے شانوں والا آپ کے بارے میں کسی سے کہہ رہا تھا کہ آپ اس قافلہ کے خود ساختہ میر ہیں۔"

"خود ساختہ؟"

"ہاں اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس قافلہ کا میر بننے کا اصل مستحق وہ خود ہے۔ قافلہ کے کئی مسافروں کو اس نے اپنی حمایت میں کر لیا ہے۔ مجھے تو وہ بہت بڑا ٹھگ رہا ہے۔"

"لگتا ہے سیاست یہاں بھی در آئی ہے۔ مگر فکر مت کرو۔ میں اس کے شانے سیدھے کر دوں گا۔"

"وہ شاید میری نگاہ میں نمایاں ہونے کی کوشش میں یہ سب کر رہا ہے۔"

"بے وقوف ہے۔ چھوڑو ——— ہٹاؤ۔"

پھر اس نے رک کر قافلہ سے کہا: "مجھے ادھر افق پر کچھ پرندے اڑتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے جنگل قریب آ گیا ہے"

قافلہ میں ایک لہر دوڑ گئی۔ سب کے چہرے مسرت سے چمکنے لگے۔ ہنسنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ قہقہے گونجنے لگے۔

"ہم اپنی نئی دنیا سے بہت قریب آ گئے ہیں اور طلسم زدہ شہر کے حصار سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ جنگل ہمارے خوابوں کی سرسبز جنت ہے۔ جہاں ہم بہت بے فکری کی زندگی گذاریں گے۔"

"جنگل کا سارا حسن ہماری روح میں اتر کر ہمیں لازوال مسرتوں سے ہمکنار کر دے گا۔ وہاں ہمیں کسی بھی شئے کی کمی کا احساس نہیں ہوگا۔ سکون و اطمینان ہمارے ساتھ رہے گا۔ پورا جنگل ہماری تعظیم کرے گا۔"

"جنگل دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ثمر بار درخت، پرندے، جانور، پھول، پتے، آبشار، دلکش مناظر اور سب سے اہم بات یہ کہ شہر کی طرح وہاں ہمیں کسی بھی لمحہ موت کا کھٹکا نہیں رہے گا۔"

قافلہ سالار نے کہا: "اب رفتار تیز کر دو۔ تاکہ ہم شام ہونے سے قبل ہی جنگل تک پہونچ جائیں۔"

قافلہ صحرا کے سینے پر نہایت تیز چلنے لگا۔ سب کے جسم پسینوں سے شرابور تھے اور پاؤں سے سر تک ریت ہی ریت تھی مگر دور اڑتے ہوئے پرند دیکھ کر ان کے اندر نئی قوت چلی آ رہی تھی اور وہ جوش میں بڑھتے جا رہے تھے۔

دفعتاً قافلہ سالار ٹھٹھک کر رک گیا اور اس نے مڑ کر کہا۔

"سامنے غور سے دیکھو ——— مجھے پسِ سراب کچھ سر رینگتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔"

سب حیرت سے ادھر دیکھنے لگے۔

"ہاں ——— بہت سارے سر۔ اب کیا ہوگا؟"

"کہیں وہ قزاق تو نہیں ؟"

"سب ریت پر لیٹ جائیں "

سب ریت پر لیٹ کر سر اٹھائے ادھر دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد سامنے ریت پر سر کے ساتھ ساتھ جسم بھی نمودار ہوئے اور پھر انھوں نے دیکھا کہ جنگل کے بہت سارے لوگ اپنے مال و اسباب کے ساتھ اسی سمت چلے آ رہے تھے۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

جنگلی جب قریب آئے تو انھوں نے دیکھا کہ سب بہت اداس تھے۔

قافلہ سالار نے ان سے پوچھا۔ "تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو ؟"

ان میں سے ایک نے کہا: "جنگل سے"

"اور اب کہاں جا رہے ہو...... اور اتنے اداس کیوں ہو ؟"

وہ بولا۔ "یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ کیا کرو گے جان کر۔

لڑکی نے کہا۔ "مگر کچھ تو بتاؤ"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا

"ہم لوگ جنگل کی زندگی سے اکتا گئے ہیں۔ ہمیں ہر وقت آدم خور انسانوں اور بھیڑیوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ وہ آئے دن ہم پر حملہ کرتے ہیں اور بہت ساری جانیں لے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم سب شہر جا رہے ہیں"

قافلہ والوں نے محسوس کیا کہ وہ عظیم شہر اور عظیم جنگل کے بیچ میں مصلوب ہو چکے ہیں۔

سلطان سبحانی نئی فکر اور نئی تحریر کے ایک قابل اعتماد ہمراز کا نام ہے جس نے تخلیق اظہار کے لئے خود کو صرف شاعری تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ افسانہ نگاری کے ذریعے بھی ماجرائے دل بیان کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہے۔ حالانکہ یہ کسی بھی لکھنے والے کے لئے ایک خطرناک موڑ ثابت ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر اردو میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ کسی مصنف نے ایک سے زیادہ اصنافِ ادب کو اپنے وسیلۂ اظہار بنایا ہو اس سے خطرہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ مذکورہ اصناف کی کسی ایک کی طرفداری کرنے کے لئے از خود تقسیم ہو جاتا ہے۔ ورنہ ہمیں تو بہر حیثیت ادیب ہی کی خطرے کی زد پر ہوتا ہے۔

کسی شاعر کے لئے افسانہ نگاری کی طرف مائل ہونے میں دوسرا خطرہ یہ رہتا ہے کہ وہ شاعری کے بیشتر لوازمات مثلاً رمز، کنایہ، علامت وغیرہ لاشعوری طور پر افسانہ نگاری میں لے کر آجاتا ہے اور شاعری کے یہ سارے حسن ساز اوصاف افسانہ کے بنیادی ڈھانچہ، بیانیہ، کیلئے بہت ضروری نہیں ہوتے، لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانہ اس فکری تجربہ سے بھی بآسانی گذر گیا اور یہ طے کر گیا کہ اس کی صحت کے لئے اس کو ابہام اور علامت اور اشاریت کی کتنی مقدار پلائی جانی چاہیئے۔ اب اس التزام سے افسانہ کی روایت کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

اس کوشش میں سلطان سبحانی مجھے ایک ٹریفک کانسٹبل کی طرح چوراہے پر کھڑا ہو کر ہاتھ ہلاتا ہوا نظر نہیں آیا بلکہ وہ خود انسانی ہجوم میں گم ہو کر اپنے دونوں ہاتھ ہی تلاش کرتا ہوا معلوم ہوا ہے جو مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں اس کے لئے ایک امتیازی شان کا درجہ رکھتے تھے۔

سلطان سبحانی کے اس فکری رجحان کا میں اس لئے خیر مقدم کرتا ہوں کہ اس کی بات سمجھ میں آجاتی ہے اور اس سے اردو افسانہ کے پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور معنی خیز ہونے کے امکانات بھی روشن نظر آتے ہیں۔

رام لعل

یکم اگست ۱۹۸۷ء

لکھنؤ

سلطان سبحانی جس نے اپنی زندگی کا بیشتر سفر بیسویں صدی کے ربع سوم میں طے کیا ہے چنانچہ اس نے ایک طرف انسان کی خلا نوردی کا مشاہدہ کیا تو دوسری طرف اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی غربت کو دیکھا۔ ان دونوں مشاہدات میں جو بعد المشرقین ہے اس نے سلطان سبحانی کے ہاں عجیب زہرخند کیفیت پیدا کی ہے وہ مسرتوں کو حاصل ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ انہیں تقسیم کرنے کی آرزو بھی کرتا ہے۔ تاہم جب زندگی اپنی اصلی روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو وہ طنز کی زہرناکی سے بھی اپنا دامن چھڑا نہیں سکتا۔

سلطان سبحانی کے افسانے تاثر کی ڈولتی ہوئی کرن کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تاثر بعض اوقات چند جملوں میں سما جاتا ہے اور کسی کنکریٹ کردار کا سہارا تک نہیں لیتا، بعض اوقات یہی تاثر طویل افسانے کا روپ دھار لیتا ہے اور نہ صرف پوری صورت واقعہ کو ابھارتا ہے بلکہ کرداروں اور فضا کی تخلیق بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

(اوراق" لاہور پاکستان)

آپ کا افسانہ "چابک بدست امام" تاثر سے بھرپور ہے۔ جذبے اور احساس حد بندیوں اور فاصلوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آپ نے اس دکھ کو جس سطح پر محسوس کیا ہے وہ میرا بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ افسانہ میں نے لکھا ہے۔ اظہار بھی خوبصورت ہے۔ آپ نے کمال فنی چابکدستی سے اسے گمبھیر کر کے پھیلا دیا ہے۔ یہاں اس حوالے سے کوئی بڑا افسانہ لکھا نہیں گیا۔ دکھ اتنا شدید ہے کہ شاید اس میں برہمی لگے۔ اسکی وجہ قریبی فاصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ نے بلاشبہ اس حوالہ سے بڑا افسانہ لکھا ہے اور مصنوعی دوریوں اور حد بندیوں کو توڑ دیا ہے۔ ذہنی اور فکری وابستگی اور نظریاتی تسلسل کا یہ تحرک تیسری دنیا کی ترقی پسند سوچ میں ایک مبارک مرحلہ ہے۔

رشید امجد

راولپنڈی۔ پاکستان،

میرا کھویا ہوا ہاتھ

سلطان سبحانی

ہم زبان پبلیکیشنز
۱۹۳ ـ ایم ایچ بی کالونی، مالیگاؤں (ناسک)

میرا کھویا ہوا ہاتھ

سلطان سبحانی

۱۹۳ — ایم ایچ بی کالونی۔ مالیگاؤں (ناسک)

تصانیف

اجنبی نگاہیں (افسانے)

راستے بھی چلتے ہیں (افسانے)

شاعری کی دوکان (طنز و مزاح)

پت جھڑ کی خوشبو / گنج رواں (شاعری)

حکمنامہ (شاعری)

میرا کھویا ہوا ہاتھ (افسانے)

آئندہ تصنیف

بدن گشت بادبان (افسانے)